برگِ حنا

FRIENDSKORNER.COM

بہت پیارے

گلزار

کے نام

جو فلمی ہدایت کاری، گیت

نگاری اور مکالمہ نویسی میں غیر

فانی شہرت رکھنے کے علاوہ ایک

بڑے افسانہ نگار بھی ہیں

FRIENDSKORNER.COM

ترتیب

جن وانس	4
وحشی	23
بیٹے بیٹیاں	29

FRIENDS KORNER
FRIENDSKORNER.COM

جن وانس

گلی میں قدم رکھتے ہی ماسٹر محمد یونس کو محسوس ہوا کہ وہ غلط جگہ پر آ گیا ہے۔ بائیں طرف تو خیر ایک مکان کا پچھواڑہ تھا۔ مگر دائیں ہاتھ کو مٹی کی ٹیڑھی میڑھی دیوار پر عورتوں اور ان کے کندھوں سے لگے ہوئے بچوں کے میلے کچیلے بے دھلے چہرے یوں رکھے تھے جیسے گھڑونچی پر چھوٹے بڑے کائی لگے گھڑے سجے ہوئے ہیں۔ گلی طے کرنے تک ماسٹر یونس نے ان کی طرف کوئی تین بار دیکھا اور تینوں بار اسے یہی شبہ گذرا کہ سب نے بچوں سمیت ایک ساتھ اسے آنکھ ماری ہے۔ اگر منشی اللہ یار ناشاد اس کے آگے آگے نہ جا رہا ہوتا تو وہ کہیں رک کر سوچ لیتا کہ اگر آگے جانا بہت ضروری نہیں ہے تو آگے نہیں جانا چاہیے۔ کوڑے کی ایک ڈھیری پر جو مرغی مرغا دانہ چگ رہے تھے وہ بھی پہلے تو کڑکڑائے مگر پھر چونچیں کھول کر ماسٹر یونس کو انسانوں کی طرح دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگے۔ سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ گلی کے بالکل مقابل والے دروازے پر جو عورت بائیں کندھے سے چوکھٹ کا سہارا لئے اور صرف بائیں ٹانگ پر زور دیئے کھڑی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ماسٹر یونس کو اسے دوسری بار دیکھنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ وہ کالے تہبند۔ کالے چولے اور کالے دوپٹے میں سچ مچ چمک رہی تھی۔ پھر اس عورت کے قریب پہنچ کر تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ سراسر غلط جگہ پر آ گیا ہے۔ عورت نے دماغ چیر دینے والی خوشبو لگا رکھی تھی اور خوشبو صرف سونگھنے ہی کی نہیں دیکھنے کی بھی چیز ہوتی ہے۔ سو ماسٹر یونس نے خوشبو کے منبع کی طرف دیکھا اور اسے یہ معلوم کر کے صدمہ سا ہوا کہ یہ عورت تو قریب سے بھی خوبصورت ہے۔ کالے دوپٹے کے نیچے اس کے ڈھیروں بال اس کے کندھوں اور سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں کی طرف جاتی ہوئی چیرویں آنکھیں پپوٹوں سے آدھی آدھی ڈھکی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر کچھ ایسی خفیف سی مگر ہمہ گیر مسکراہٹ تھی دیکھو تو کچھ نہیں اور سوچو تو بہت کچھ ہے

منشی اللہ یار کے قدموں کی تیزی بتا رہی تھی کہ وہ دائیں طرف کو فوراً مڑ جانا چاہتا ہے۔ مگر یکا یک وہ یوں بھدے پن سے رک گیا جیسے نہ رکتا تو اس کا انجام نیک نہ ہوتا۔ ''خیر ہے بیگماں؟'' اس نے عورت سے پوچھا۔ پھر فوراً بولا۔ ''ہمارے سکول میں یہ نئے ماسٹر آئے ہیں۔ ماسٹر محمد یونس، انگریزی پڑھاتے ہیں۔ بی۔ اے پاس ہیں۔''

بیگماں نے پپوٹے اٹھا کر اپنی لمبی لمبی بادامی آنکھیں پوری کھول دیں اور بولی۔ ''ہم تمہارے پڑوسی ہیں منشی جی۔''

ماسٹر یونس کو جواب میں کچھ نہ سوجھا۔ اس نے صرف مسکرانے کو کوشش کی۔ پھر منشی اللہ یار اس کی مدد کو پہنچا اور کچھ یوں بولا جیسے بیگماں کی بات کا ترجمہ کر رہا ہو۔ ''یہ بیگماں آپ کی پڑوسن ہے یونس صاحب!''

ماسٹر یونس جواب میں ایک بار پھر مسکرایا اور منشی اللہ یار کے پیچھے دائیں طرف کو مڑ گیا۔ سامنے مقفل دروازے کے پاس پہنچنے تک اسے اپنی گدی پر بیگماں کی نظریں محسوس ہوتی رہیں۔ پھر اس نے پلٹ کر چوروں کی طرح دیکھا تو بیگماں وہاں نہیں تھی صرف اس کی خوشبو تھی جو ہر طرف سے امڈی آ رہی تھی۔

''بڑی تیز خوشبو ہے!'' یونس نے آہستہ سے منشی اللہ یار کو جیسے راز کی ایک بات بتائی۔

منشی اللہ یار جو چابی والا ہاتھ تالے کی طرف بلند کر رہا تھا، تالے کو مٹھی میں پکڑ کر ذرا سا گھوما۔ بیگماں کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر یونس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر عورتوں اور بچوں کا رخ دیکھ کر جو دیوار سے ہٹ آئے تھے۔ صحن کے پرلے گوشے میں سے جھولتے ہوئے چھپر کے پاس دھوپ میں ایک بڑھیا پیڑھی پر بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔ ''خیر ہووے اے منشیو'' وہ حقے کا کش ختم کر کے بڑی کراری آواز میں بولی۔ ''جوانیاں مانو۔ علم پڑھاؤ، اقبال بڑھے۔ دشمن زیر ہوں، سجن ڈھیر ہوں۔ ہم غریب میراثیوں کے آنگن کو تو آج بھاگ لگ گئے۔ اے بانو۔ اے کتیا کی اولاد۔ کھڑی بٹ بٹ کیا تکے جا رہی ہے۔ کیا تو اپنی عادتوں سے یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ ہم میراثی ہیں؟ جا کہیں سے لسی مانگ لا۔ سردیوں میں لسی فولاد کا عرق بن جاتی ہے۔ ادھر بشیر باؤ کے ہاں چلی جا۔ کہنا روز اتنی لسی بچتی ہے کہ بچھڑوں کو پلا دیتے ہیں۔ آج بچھڑے نہیں پئیں گے تو ہمارے منشی جی پی لیں گے۔ نمک کی ڈلی وہیں سے گھماتی لانا۔ آج میں نے نمک دانی کے چاروں خانے دیکھے ہیں اس میں چڑیا کی بیٹ جتنا بھی نمک نہیں ملا۔ مجھے تو لسی میں نمک کی جگہ کھار ملا کر پلا دیتی ہوگی تو پر تو اپنی سی کر دیکھ میں بھی تیرے جیتے جی تو تجھے مر کر نہیں دوں گی۔ وہ اور تھا جسے تو نے ڈس لیا تھا۔ میں تو مروں گی تیرے جنازے پر شہادت کی انگلی گھما کر''

منشی اللہ یار تالے کو مٹھی میں لئے بڑھیا کی طرف دیکھتا رہا۔ ماسٹر یونس بڑی سنجیدگی کے ساتھ نئے ماحول سے متعارف ہو رہا تھا۔ ایک میلی کچیلی نوجوان عورت آگے بڑھی چولھے پر سے ایک بڑا سا کٹورا اٹھایا اسے اپنے دوپٹے سے اندر باہر پونچھا اور بڑھیا کے پاس آ کر بولی۔ ''اے پھوپھی، اللہ کرے میں کل کی مرتی آج مر جاؤں۔ پر تو ایک ایک روپے کی شرط لگا لے۔ پہلے تو مرے گی۔''

سب عورتیں ایک ساتھ ہنسیں۔ مگر بانو مسکرائی بھی نہیں۔

بڑھیا بانہوں کو ہوا میں پھیلا کر پکاری۔ ''اے کتیا کی اولاد، کیا مجھے شرط لگا کر ایک روپیہ ہارنا ہے۔'' پھر ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگی۔ بانو بھی مسکرا دی اور ہاتھ میں کٹورا لئے چلی گئی پھر منشی اللہ یار بھی زور سے ہنسا اور ماسٹر یونس نے سوچا کہ آخر یہ کیا بات ہوئی۔ آخر منطق کا وہ کون سا اصول ہے جس کے تحت اس موقعہ پر بڑھیا کا ہنسنا جائز تھا۔ بانو نہ جانے اس کی کیا لگتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ بہو ہوگی۔ مگر ساسیں تو ایسی منہ پھٹ بہوؤں کو نوچ کے ڈال دیں۔

یکا یک بڑھیا عورتوں اور بچوں پر برس پڑی۔ ''تم کیا منشیوں کو اپنے گھیرے میں لئے کھڑے ہو۔ جاؤ اپنے اپنے گھر جاؤ۔ منشی قربانی کا گوشت تھوڑی ہیں کہ جھپٹے پڑ رہے ہو کم بختو۔''

سب ہنسنے لگے اور منشی اللہ یار بھی ہنس رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے زنجیر کھولی۔ ہنستے ہوئے کواڑ کھولے اور کھوٹے کے اندر جانے سے پہلے اس نے یہ کہنا بھی ضروری سمجھا کہ ''ماسی نوراں آخر تو کسی دن بوڑھی بھی ہوگی؟''

''نہیں!'' بڑھیا نے زبان اور تالو سے نفی کا خاصا زوردار پٹاخہ چھوڑ کر بڑے رعب سے کہا۔ پھر بڑھیا سمیت سب اس زور سے ہنسے کہ اپنے دروازے پر سے بیگماں پکاری ''ماسی نوراں بولی ہوگی۔''

جھینپنے کے بجائے بیگماں نے بھی زور کا ایک قہقہہ لگایا اور ماسٹر یونس چکرا کر رہ گیا یقیناً وہ نہایت غلط جگہ پر آ گیا تھا۔

میٹرک تک ہم جماعت رہنے کے بعد محمد یونس اور اللہ یار کی راہیں الگ الگ ہو گئی تھیں اور اب ماسٹر یونس اور اللہ یار منشی کی حیثیت

میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے یونس نے اللہ یار سے ایک طویل خط میں تجدید محبت کی تھی اور بھرپور محبت کا جواب پایا تھا۔ یونس مطمئن تھا کہ وہ ایک بالکل اجنبی جگہ میں اجنبی نہیں ہوگا اور اللہ یار خوش تھا کہ وہ اپنے مڈل سکول میں مقرر ہونے والے انگریزی کے پہلے ماسٹر کو بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ ساتھ لئے پھرے گا۔ دونوں غرض مند تھے اس لئے ملاقات کے بعد پانچ دس منٹ کے اندر وہ جدائی کے چند برس پھاند گئے اور ہم جماعتوں کی اپنائیت برتنے لگے۔

سکول میں ماسٹر یونس کے پہنچتے ہی منشی اللہ یار نے سکول کے چوکیدار کے سر پر اس کا بکس اور بستر رکھا اور اس کے ساتھ چند لڑکے کر دیئے۔ جنہوں نے مل کر کوٹھے کو جھاڑا پونچھا۔ اب تفریح کے وقفے میں وہ یونس کو اس کا مکان دکھانے لے آیا تھا یونس نے جب کوٹھے میں قدم رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہاں تھوڑی ہی دیر پہلے چھڑکاؤ ہو چکا ہے۔ کچے فرش کی مٹی جاگ رہی تھی اور سوندھی سوندھی خوشبو سے کوٹھا لبالب بھرا ہوا تھا۔ چھت کے عین درمیان میں ایک گول سا بادریہ تھا جس میں دھوپ ایک ترچھے سے ستون کی شکل میں چھت سے فرش تک گڑی ہوئی تھی اور کوٹھے کے گوشے تک روشن ہو رہے تھے کوٹھے میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو مٹی کی دو بڑی بڑی الماریاں سی تھیں جو دیہات میں سکاریں کہلاتی ہیں اور اناج کے ذخیرے کے کام آتی ہیں۔ منشی اللہ یار نے بعد میں اسے بتایا کہ اب ان سکاروں میں پھٹے ہوئے ایک ڈھول اور ٹوٹی ہوئی ایک شہنائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار کے ساتھ رنگ رنگ کے سوت سے بنی ہوئی رنگیلے پایوں کی ایک پلنگڑی رکھی تھی اس پر بیٹھ کر باہر دیکھنے سے کچی ٹیڑھی دیوار کا ایک حصہ اور بیگماں کے گھر کے سامنے والا موڑ نظر آتا تھا جہاں منشی اللہ یار ٹھٹکا تھا۔ میراثیوں کے مکان نظروں سے اوجھل رہتے تھے جو دوسری طرف ایک دوسرے میں بھینچے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ایک دالان تھا جس نے ایک کونے میں وہ جھکا ہوا چھپر تھا جس کے پاس بوڑھی نوراں پیڑھی پر بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔ یونس کی اس قیام گاہ سے نکلتے ہوئے بائیں طرف تو یہ چھپر پڑتا تھا اور دائیں طرف ایک تنگ صحن تھا جسے ایک پست دیوار، بیگماں کے گھر کے صحن سے جدا کرتی تھی۔ اس دیوار کے بالکل سامنے بیگماں کا کوٹھا اور جہاں انہیں بیگماں کھڑی نظر آئی تھی وہ اس کی ڈیوڑھی کا دروازہ تھا۔

کوٹھے کے فرش اور چھت کی صفائی کا جائزہ لینے کے بعد منشی اللہ یار نے یونس کو بتایا کہ نوراں بانو کی ساس اور مست الست کی ماں تھی۔ بانو کے پیدا ہوتے ہی نوراں نے اسے اپنے بھائی سے اپنے بیٹے کے لئے مانگ لیا تھا۔ مست الست کا نام تو میراں بخش تھا۔ مگر جب اس نے جوان ہو کر شہنائی بجانی شروع کی اور ساتھ ہی اس پر جن آنے لگے تو لوگوں نے اسے مست الست کہنا شروع کر دیا۔ یہ کوٹھا اسی مست الست نے بنوایا تھا۔ کہتے ہیں جب شادی کی محفلوں میں نکاح خوانی کے وقت ڈھولوں اور شہنائیوں کو بند کرنے کا اشارہ کیا جاتا تھا تو مست الست شہنائی پر سے انگلیاں ہٹا کر بچوں کی طرح رونے لگتا تھا۔ ایک بار جب کسی ایسے ہی موقعہ پر اس نے شہنائی بجانا بند نہ کی تو ایک بوڑھے میراثی نے شہنائی کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی، آواز بے سری ہوگئی تو مست الست نے اپنی بڑی بڑی لال لال آنکھوں کھولیں شہنائی کو گھٹنے پر رکھ کر تڑ سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور انہیں بوڑھے کی طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ ''لو چچا آج رات کا چولھا اسی سے جلانا۔'' پھر وہ اٹھا اور چلا گیا۔ جب سے گاؤں والوں کو یقین ہو گیا کہ مست الست پر جن آتے ہیں۔ بوڑھی نوراں دور دور

سے تعویذ لاتی رہی اور اپنے بیٹے کو گھول گھول کر پلاتی رہی، سونے چاندی میں مڑھے ہوئے کئی تعویذ مست الست کے بازوؤں پر باندھے اور گردن میں لٹکائے، پھر کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مست الست کی شادی کر دے۔ کیونکہ جن عموماً کنواروں اور کنواریوں پر ہی آتے ہیں۔ نوراں برسوں سے گانے بجانے اور عید بقرعید کی کمائی جمع کر رہی تھی۔ وہ فوراً بانو کو بیاہ لائی، مگر اب مست الست نے شہنائی بجانا بند کر دی۔ یہ اس کی شادی کے کوئی چار مہینے بعد کی بات ہے۔ نوراں نے بانو کو سمجھایا کہ وہ بڑے پیار کے ساتھ مست الست سے شہنائی بجانے کا مطالبہ کرے۔ مست الست یہیں اسی رنگین پلنگڑی پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ بانو نے آ کر پھوپھی کا مطالبہ دہرا دیا۔ مست الست بولا۔ ''واہ کیوں نہیں بجاؤں گا۔ لاؤ میری شہنائی کہاں ہے۔'' پھر وہ شہنائی بجانے لگا اور نوراں اور دوسری میراثنیں اور میراثی دروازے سے ایک طرف ہٹ کر خوش خوش شہنائی سننے لگے۔ بیگماں بھی اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پر نمودار ہوئی اور مست الست کو دیکھنے لگی۔ بانو جو بڑے غرور کے ساتھ سر اٹھائے اور سینے پر بازوؤں کی قینچی رکھے پلنگڑی کی پائنتی کی طرف کھڑی تھی۔ یکا یک گھبرا سی گئی۔ مست الست کا سارا خون کھنچ کر اس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا اور اس کا ماتھا پسینے کے قطروں سے اٹ گیا تھا اور انگلیاں جیسے تشنج میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ تب بانو چیخ کر باہر نکلی اور پکاری۔ ''میرے مست الست کو تو کچھ ہو گیا ہے۔'' سب اندر کوٹھے میں گھس آئے۔ بیگماں باہر گلی میں آ گئی۔ مگر پھر واپس چلی گئی۔ ''جن آ گئے ہیں'' ایک بوڑھے میراثی نے کہا اور ''بسم اللہ'' پڑھ کر شہنائی کا سرا ایک جھٹکے سے مست الست کے ہونٹوں میں سے نکال لیا۔ مگر ہوا یہ کہ شہنائی بوڑھے کے ہاتھ میں آ گئی اور مست الست پیچھے گر گیا۔ پھر جب اس کی نبضیں دیکھی گئیں تو وہ مر چکا تھا۔ اس وقت نوراں نے دھڑاک سے ایک دوہتڑ اپنے سینے پر مارا اور پھر ایک دوہتڑ ابانو کی پیٹھ پر مار کر بین کرنے لگی۔ ''میرے مست الست کا دم تو یہ سانپنی پی گئی لوگو، یہ جو میری بھتیجی ہے، میری بہو ہے میرے بیٹے کی قاتل ہے۔''

منشی اللہ یار یہ واقعہ سنا چکا تو رازداری کے لہجے میں بولا۔ ''ہر ماں جس کا بیٹا اس کی بہو سے پہلے مر جاتا ہے بہو کو یہی طعنہ دیتی ہے اور پھر بانو تو بے چاری تو سیدھی سادی فرمانبردار اور بے زبان بہو ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مست الست پر جن نہیں آتے تھے۔ بیگماں آتی تھی۔ لیکن وہ میراثی تھا اندر ہی اندر بھنتا رہا۔ بات زبان پر لاتا تو قتلے اڑ جاتے۔ سو دوسروں کے ہاتھوں مرنے کے بجائے اس نے اپنے آپ کر مار ڈالا۔ اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کی موت کے بعد بیگماں اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پر آتی اور مست الست کے کوٹھے کی طرف دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو جاتا مگر وہ دیکھتی رہتی۔'' یونس کچھ یوں خوفزدہ نظر آنے لگا۔ جیسے اسے ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں لا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جہاں بلی کی آنکھیں بھی چیتے کی آنکھوں کی طرح چمکتی ہیں۔ بڑی مشکل سے بولا۔ ''کیا آپ کو اتنے بڑے گاؤں میں میرے لئے یہی مکان مناسب نظر آیا تھا یار صاحب؟''

''نہایت غیر مناسب جگہ ہے۔'' ''منشی اللہ یار بڑی عاجزی سے بولا۔ مگر سردیوں کا موسم ہے جب باہر کھیتوں میں رات دن گذارنے والے کسان بھی اپنے گھروں میں اٹھ آتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی یہ مکان ناپسند ہے۔ مگر میں نے کہا پڑھا لکھا انسان اپنا ماحول آپ بنا لیتا ہے۔ میں کسی دوسرے مکان کی کھوج میں رہوں گا جب تک سے سر چھپانے کی ایک جگہ سمجھ لیجئے۔ پھر یہ میراثی بڑے تابعدار بڑے بے ضرر لوگ ہیں۔ ڈھول شہنائی کی آوازیں البتہ آپ کو پریشان کریں گی مگر۔۔۔۔''

اتنے میں بانو لسی کا کٹورا ہاتھ میں رکھے آئی۔ بسم اللہ کہہ کر اسے یونس نے ہاتھ میں تھما دیا۔ کٹورا لیتے ہوئے یونس نے بانو کو آنکھ بھر کر دیکھا اور کٹورا چھلک کر رہ گیا۔ ''بسم اللہ بسم اللہ'' کہہ کر بانو نے اپنے میلے چیکٹ دوپٹے میں یونس کی شلوار پر گرے ہوئے لسی کے چھینٹے کو جذب کر لینا چاہا۔ وہ ''نہیں، نہیں کوئی ہرج نہیں۔'' کہتا رہ گیا۔ مگر جب بانو دوپٹے کا پلو سنبھال کر سیدھی کھڑی ہو گئی تو دوپٹے کا میل یونس کی چمکتی ہوئی شلوار کے بھیگے ہوئے حصے میں منتقل ہو چکا تھا۔ ''کوئی ہرج نہیں معمولی بات ہے۔'' اس نے بانو کی گھبراہٹ کم کرنے کے لئے کہا اور پھر اپنی گھبراہٹ کم کرنے کے لئے لسی کا اتنا بڑا کٹورا ایک ہی سانس میں غٹ غٹ چڑھا گیا۔ آخری گھونٹ پر سے خیال آیا کہ اس نے منشی اللہ یار کا حصہ بھی پی لیا ہے مگر چپکے سے کٹورا بانو کے حوالے کر دیا۔ بانو واپس چلی گئی۔

منشی اللہ یار بولا۔ ''بانو کو آپ نے دیکھا؟ اگر کسی صاف ستھری دھلی دھلائی عورت کا ایسا ہی ناک نقشہ ہو تو کیا کوئی عورت اس کے سامنے سے نظریں جھکائے بغیر گذر سکے گی؟

مست الست کے بعد کسی نے اسے کنگھی کئے بالوں اور دھلے ہوئے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔ اسی لئے لوگ اب یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ بانو پر بھی جن اتر آنے والے ہیں لوگوں کو یقین ہے کہ مست الست کو اس جن نے مار ڈالا ہے اور اب بھی راتوں کو اس کوٹھے سے شہنائی اور ڈھول بجنے کی آوازیں آتی ہیں۔ جو اچانک شروع ہوتی اور اچانک تھم جاتی ہیں اور پھر ٹوٹتی رات تک گاؤں کی اندھیری گلیوں میں کوئی سسکتا اور کراہتا گھومتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ڈھول اور شہنائی ان سکاروں میں رکھے ہیں اور اب تک کسی نے انہیں نہیں چھوا۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے لڑکوں کو کوٹھا صاف کرنے بھیجا تھا۔ صفائی تو کر گئے ہیں۔ مگر کہتے ہیں انہوں نے تالا کھولا تو ان کے پسینے نکل گئے۔ پھر اندر کوٹھے میں وہ جس گوشے میں بھی گئے کوئی انہیں اپنے بالکل قریب لمبی لمبی سانسیں لیتا محسوس ہوا۔ بعد میں بانو فرش پر پانی چھڑکنے آ گئی تو ان کی جان میں جان آئی۔ ادھر نوراں نے بانو سے کہا۔ کہ ایک ایک جن سب ''پڑھا کوؤں'' کو پکڑ کر کھیلنے کے لئے دے دو۔ یہ بھی کیا یاد کریں گے۔ کہ میراثیوں کے گھر آئے تھے۔ اس پر سب ہنستے رہے اور یوں انکا خوف دور ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے؟''

''کوئی بات نہیں'' یونس کو لسی کے کٹورے نے کافی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ ''جنات سے گپیں رہیں گی۔ وقت اچھا کٹ جائے گا۔''

منشی اللہ یار بڑے اطمینان کی ہنسی ہنسا۔ ''مجھے معلوم تھا آپ ایسا تعلیم یافتہ آدمی ان وہموں کو خاطر میں نہیں لائے گا۔''

دونوں سکول جانے کو اٹھے ہی تھے کہ بانو لسی کا ایک اور کٹورا لئے آ گئی اور اسے منشی اللہ یار کے ہاتھ میں تھما کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ''تم نے تو حد کر دی بانو۔'' منشی اللہ یار اس مدارت سے واقعی گھبرا گیا تھا۔ ''یہ کیا بات ہوئی کہ تم ہمارے لئے محلے بھر سے لسی ڈھوتی پھرو۔''

یونس فوراً بولا۔ ''پہلے آپ کا حصہ میں پی گیا تھا نا۔''

''اب ان کا حصہ آپ پی جایئے۔'' بانو نے منشی اللہ یار سے کہا۔

تینوں ایک ساتھ ہنسے اور باہر بوڑھی نوراں کی آواز آئی۔ ''اے بانو مجھے بھی بتا کیا بات ہوئی، کہیں کوئی جن تو نہیں پکڑ لیا منشیوں

نے؟''

''اللہ توبہ ہے۔'' بانو نے سنجیدہ ہو کر کانوں کو ہاتھ لگائے اور کٹورا لے کر کوٹھے سے باہر نکل گئی۔

سکول میں چھٹی کے بعد یونس گھر کی طرف روانہ ہوا تو اسے کچھ ایسا لگا جیسے وہ جیتی جاگتی دنیا سے عالم ارواح کی طرف جا رہا ہے ،اس نے دوستوں کی محفلوں میں جنات کے وجود سے ہمیشہ انکار کیا تھا۔لیکن آج دن دہاڑے جنات جیسے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے اور اس کندھوں پر سے جھانک رہے تھے۔یہ خیال بھی اسے مارے ڈالتا تھا کہ اسے سونے کے لئے جو پلنگڑی دی گئی تھی وہ بانو کی شادی کی پلنگڑی تھی اور مست الست نے اسی پر دم توڑا تھا۔اسے منشی اللہ یار پر غصہ آ رہا تھا جس نے اسے اس جہنم میں لا ڈالا تھا، جہاں ایک طرف بیگماں کا آگ کی طرح بھڑکتا ہوا حسن تھا، دوسری طرف میلی کچیلی بانو اور ٹوٹی پھوٹی نوراں تھی۔اور درمیان میں جنات سے بھرا ہوا کوٹھا تھا جہاں مست الست کے بعد ساس بہو نے ایک رات بھی بسر نہ کی۔مگر ایک غریب پردیسی استاد کے لئے اسے ڈیڑھ روپیہ ماہانہ کرائے پر اٹھا دیا۔لالچ بری بلا ہے۔اس نے سوچا۔اس لالچ نے بیگماں کے حسن کو حلوائی کے طشت میں سجے ہوئے بتاشوں کے ڈھیر میں بدل دیا ہے۔اور جو جوانی کے لئے بھک منگوں کی طرح دن رات گانے بجانے پر مجبور کرتا تھا اور جو ایک بڑھیا کے دل میں جس کا اکلوتا نوجوان بیٹا مر چکا تھا۔اس خیال کو پھٹکنے بھی نہیں دیتا کہ جس آدمی کو اس نے اپنا مکان پلنگڑی سمیت ڈیڑھ روپیہ ماہانہ کرائے پر دے دیا ہے وہ بھی نوجوان اور وہ بھی ایک ماں کا بیٹا ہے۔

یونس اس ارادے سے اپنی گلی میں مڑا کہ وہ بیگماں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔مگر بیگماں کا دروازہ خالی تھا۔اس نے اطمینان کی ایک سانس لی اور لپک کر میراثیوں کے صحن میں آ گیا تو نہ چھپر کے پاس اسے نوراں دکھائی دی نہ چولھا خانے میں اسے بانو نظر آئی۔اس نے چابی تالے میں ڈالی تو تالا اسے موت کی طرح ٹھنڈا محسوس ہوا۔ایک دم اس پر خوف سوار ہو گیا۔یہ سب کم بخت کہاں غائب ہو گئے۔دن کو ننگ دھڑنگ بچے اس نے دیکھے تھے وہ سب کہاں اڑ گئے۔منڈیروں پر سے چڑیاں تک غائب تھیں۔ہر طرف الو بول گیا تھا۔

اس نے تالے میں چابی گھما دی۔کواڑ کی ایک چول خاصی بھاری آواز میں بولی۔

''آیئے'' وہ گھبرا گیا مگر پھر مسکرانے لگا۔ہمت باندھ کر اندر دیکھا تو چھت کے بادریہ میں سے سورج کی روشنی اب چھ سات دن کا چاند بن کر اس دیوار پر چمک رہی تھی۔جس کے ساتھ رنگین پلنگڑی رکھی تھی۔ایک بھونرا چھت کی ایک ایک لکڑی کو سونگھتا پھر رہا تھا اور اس کے پروں سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کہیں دور ہوائی جہاز اڑ رہا ہے۔

کچھ سوچ کر اس نے سینہ تان لیا اور پلنگڑی پر جا بیٹھا، مگر بیٹھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا، بیگماں دروازے میں کھڑی سامنے گلی میں دیکھ رہی تھی۔یونس اب کے آہستہ سے پلنگڑی پر بیٹھ گیا اور بیگماں کی ایک رخی تصویر دیکھنے لگا۔

نہ جانے اتنے صاف رنگ پر سیاہ لباس پہننے کا اسے کس نے مشورہ دیا ہے۔کہ کالے دوپٹے کا حاشیہ بھی جگمگا رہا ہے۔اس کی آنکھیں کتنی لمبی ہیں کہ کنپٹیوں کے بالوں تک آ گئی ہیں اور اس کے ہونٹ کتنے حساس ہیں۔بالکل گلاب کی پنکھڑیاں کہ ہاتھ بھر کی بلندی

سے بھی تتلی اڑتی ہوء گذر جائے تو کپکپا کر رہ جائیں اور ٹھوڑی سے مڑتا ہوا خط کتنی لمبی گردن بناتا ہوا اس کے دونوں کندھوں پر بکھر گیا ہے۔ یکا یک بیگماں تالی بجا کر اتنی بے اختیاری سے ہنسی کہ اگر وہ پردیس میں نہ ہوتا تو اس عورت کو ڈانٹ دیتا پھر وہ اندر چلی گئی اور خوشبو کا ایک جھونکا جیسے یونس کے کوٹھے میں چلا آیا۔ ادھر سے بانو تیز تیز قدموں سے آنگن تے کرتی ہوئی بیگماں کے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہاں اسے نہ پا کر یونس کے کوٹھے کی طرف دیکھا اور اندر چلی آئی۔

''آؤ بھئی بانو کیسی ہو؟'' یونس نے پوچھا۔

''چھٹی ہوگئی منشی جی؟'' بانو نے پوچھا

''ہاں!'' وہ بولا۔

''ادھر گلی میں کوئی زور سے ہنسا میں سمجھی بیگماں ہنسی ہے۔ میں نے کہا جانے کیا بات ہے۔'' باہر آئی ہوں تو گلی خالی ہے، جانے کون ہنسا تھا۔'' بانو نے سوال نہ پوچھتے ہوئے بھی سوال پوچھا۔

یونس بولا۔ ''یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ کون ہنسا یا کوئی ہنسا بھی کہ نہیں مگر تم ہنسی کی آواز سن کر اس طرف کیوں بھاگیں؟'' یونس نے ٹوہ لگانی چاہی۔

''یہی ذرا سانس لینے کو جی چاہا۔'' بانو نے جواب دیا۔ ''اکیلا آدمی ہنستا بھی تو بھلا نہیں لگتا۔''

یونس کے تیور بتا رہے تھے کہ بانو نے وہ الفاظ کہنے سے انکار کر دیا ہے جو وہ اس سے کہلوانا چاہتا تھا۔

بانو جاتے ہوئے دروازے پر ذرا سا رکی اور پلٹ کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر پھر جیسے ارادہ منسوخ کر دیا اور چلی گئی۔

اور یونس پلنگڑی کو سکاروں کی طرف کھینچ کر اس پر کچھ ایسے رخ سے بیٹھ گیا۔ جیسے اگر اس کی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی تو بیگماں تالی بجا کر قہقہہ مار دے گی۔

شام سے کچھ دیر پہلے منشی اللہ یار آیا اور یونس کو کوٹھے کے ایک گوشے میں دبکا ہوا دیکھا تو بولا۔ ''لاحول ولاقوۃ'' آپ پلنگڑی ادھر کیوں گھسیٹ لائے۔ یہاں تو آپ ٹھٹھر جائیں گے۔ ادھر دیکھئے دروازے پر دھوپ اب تک چمک رہی ہے اور پھر دروازے میں سے آپ کم از کم آسمان کو تو دیکھ سکیں گے۔''

یونس پلنگڑی سے اٹھا اور بولا۔ ''اس عورت کا نام بیگماں سے آسمان کب ہو گیا؟''

منشی اللہ یار یار چونکا تو یونس بولا۔ ''بھئی یار صاحب، بات یہ ہے کہ دروازے میں ہر وقت وہ عورت عطر کی دکان لگائے کھڑی رہتی ہے اور یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

''کیا اچھا نہیں لگتا؟'' منشی اللہ یار نے مسکرا کر پوچھا۔ ''عورت کا کھڑا ہونا یا عورت کو دیکھنا؟''

''دونوں!'' یونس یوں ناگواری سے بولا جیسے ماسٹر اللہ یار کو پتہ ہے بیگماں نے ابھی اپنے قہقہے کا چابک مار کر یونس کی کمر دوہری کر دی ہے۔

مگر منشی اللہ یار اپنی دھن پر اڑا رہا۔ وہ پلنگڑی کو گھسیٹ کر اس کی پرانی جگہ پر لے آیا اور بولا۔ ''بیگماں کا نظر آنا نہ آنا آپ کے لئے برابر ہے۔ گاؤں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وہ آپ کی طرف یا میری طرف نہیں دیکھتی۔ وہ صرف ایک طرف دیکھتی ہے بس یہ کہ آدمی اس کے تیوروں سے گھبرا جاتا ہے۔''

پھر منشی اللہ یار نے یونس کا بستر کھول کر پلنگڑی یا، سکاروں اور دروازوں پر کنڈوں اور کیلوں سے یونس کے کپڑے لٹکائے اور پروگرام کے مطابق اسے گاؤں سے باہر گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں لے گیا۔ سورج افق میں آدھا پیوست ہو چکا تھا۔ گھروں سے نکلتا ہوا دھواں ایک موٹا میلا سا گدا بن کر گاؤں پر پھیل گیا تھا۔ تھکے ہارے چرواہے مویشی کے گلوں کے پیچھے لمبی لمبی سوٹیاں گردنوں پر رکھے اور ان کے نیچے سے دونوں ہاتھ لے جا کر دن بھر کے لٹکتے ہوئے بازوؤں کو سہارا دیئے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے بھدے بدرنگ کتے تھے۔ جو اپنے آس پاس کی ہر چیز کو سونگھتے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے یونس کو کترانے کے باوجود اس کی شلوار کا پائنچہ سونگھ لیا۔ درختوں پر چڑیوں نے چیخم چاخ مچا رکھی تھی پھر یکا یک چھدرے چھدرے بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان مقبرے کا سنہری گنبد سا بن کر چمک اٹھا۔ ہوا تیز ہو گئی جیسے اسی لمحے کے انتظار میں تھی۔ مگر اس تیزی نے گندم کے کھیتوں میں جو مسلسل اور متوازن سرسراہٹ پیدا کی۔ اس نے منظر پر خاموشی کی تہیں چڑھا دیں۔ سناٹا اتنا شدید ہو گیا کہ یونس کو ایسا لگا جیسے وہ اچانک بہرا ہو گیا ہے۔ ''یار صاحب'' وہ اپنی سماعت کو آزمانے کے لئے بولا۔ مگر اسے اپنی آواز بجلی کی کڑک کی طرح سنائی دی۔

''جی!'' منشی اللہ یار نے کہا۔

اور یونس بچوں کی طرح بولا۔ ''مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔''

منشی اللہ یار رک گیا۔ اس نے یونس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں کا گوشت اپنی گرفت میں لے کر چھوڑ دیا۔ ''حد کرتے ہیں آپ۔'' وہ بولا۔ ''مجھے اس وقت ایک شعر سوجھ رہا ہے اور آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔ کمال کرتے ہیں آپ۔'' پھر اس نے پورے آسمان پر ہاتھ گھما کر پوچھا۔ ''آپ کو اس خوبصورت غیر زمینی لمحے سے ڈر لگ رہا ہے؟''

یونس گھبرا سا گیا۔ غیر زمینی لمحہ! ماورائی لمحہ! روحیں اور جنات! مست الست اور بانو!

''بانو، تم کہاں؟ منشی اللہ یار کی آواز آئی اور یونس چیختا چیختا رہ گیا۔

منظر کے ماند پڑتے ہوئے سنہری پن میں بانو بالکل غیر زمینی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ بالکل ان دیویوں کی سو تصویر جن کے گرد ہالا بنا کر مصوران کے نقوش کو صرف اس لئے دھندلا دیتے ہیں کہ آسمان کہیں وقت سے پہلے نہ ٹوٹ پڑے۔ بانو کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ جہاں سورج ڈوب چکا تھا اور اب اپنے لبادے کے سنہری اور سرخ گوشے لپیٹ رہا تھا۔ تیز ہوا کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ جہاں رات جنم لے چکی تھی اور منظر کجلا گیا تھا۔ بجھتے ہوئے اجالے نے بانو کے نقوش کی دلربائی غیر یقینی حد تک بڑھا دی تھی اور تیز ہوا نے اس کے جسم کی تراش کی پوری تفصیل کے ساتھ نمایاں کر دیا تھا۔

''میں لکڑیاں چننے گئی تھی۔'' اس نے کہا اور جیسے سورج نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے اجالے کو سمیٹ لیا۔ شام یکا یک سیاہ پڑ گئی۔

بانو کے سر پر ہاتھ سے توڑی ہوئی لکڑیوں کا گٹھا تھا۔ جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔۔ ''گھومنے نکلے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں!'' یونس نے ماحول کا خول توڑ کر باہر نکلنا چاہا۔ ''یہ گھوم رہے ہیں اور مجھے گھما رہے ہیں۔''

بانو ہنسی، یہ ہنسی بیگماں کی ہنسی سے سراسر مختلف تھی۔ یونس نے سوچا۔ بیگماں کے قہقہے چابک کی طرح سڑاپ سڑاپ برستے ہیں۔ بانو کی ہنسی کے رنگ برنگ بنٹوں کی سی ہے جو پیتل کی پرات میں گر رہے ہوں۔

''گھوموا ور گھماؤ۔'' بانو اسی طرح ہنستی ہوئی بولی اور چل دی۔

یکا یک یونس کو خیال آیا کہ منشی اللہ یار جو آج دوپہر کو ذرا ذرا سی بات پر ہنس رہا تھا۔ اس وقت کیوں نہیں ہنسا۔ ''یار صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''جی!'' منشی اللہ یار جیسے نیند سے چونک پڑا۔

''کیا اب آپکو ڈر لگ رہا ہے؟'' یونس نے پوچھا۔

''ڈر؟'' منشی اللہ یار بولا۔ پھر اس نے دور مغرب کے سرمئی افق پر بانو کے کاجل ایسے سائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''قسم کھا کر کہیے یونس صاحب، کیا آپ نے بانو کی سی عورت کہیں دیکھی ہے؟''

یونس بولا۔ ''اگر میں جھوٹ بول دوں کہ ہاں دیکھی ہے تو آپ کیا کریں گے؟''

''میں خودکشی کرلوں گا۔'' منشی اللہ یار بھرائی ہوئی آواز میں بولا اور پھر یونس سے لپٹ گیا۔

اور یونس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس پر جن آنے والے ہیں۔

عشاء کی اذان کے بعد جب منشی یار ناشاد، یونس کو اپنے ہاں کھانا کھلا کر اور اپنی روتی بسورتی ہوئی غزلیں سنا کر ہاتھ میں لالٹین لٹکائے اسے گھر چھوڑنے آیا تو گلیاں سنسان ہو چکی تھیں۔ گھروں کے بند دروازوں سے ادھر کبھی کسی بچے کے رونے کی آواز آجاتی یا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی کتا یونہی رواروی میں چودھویں کے چاند کی طرف منہ اٹھا کر بھونک دیتا۔ اپنی گلی میں مڑتے ہی یونس کی نظریں بیگماں کے بند دروازے سے ٹکرا گئیں۔ پھر اللہ یار بولا۔ ''لو بھئی یونس صاحب ہم چلے۔ یہ لالٹین لے لیجئے۔ جلا لیجئے گا۔''

یونس منشی اللہ یار کی جھجک کا مفہوم سمجھ کر بولا۔ ''خدا حافظ، شب بخیر۔''

منشی اللہ یار کوئی جواب دیئے بغیر لالٹین تھما کر پلٹ گیا اور جب اس کے قدموں کی آواز بھی بند ہوگئی تو یونس پر چاندنی رات کا آسیب مسلط ہونے لگا۔ خون سر میں جمع ہو کر گونجنے لگا۔ اس کے کانوں کے پاس پھٹا ہوا ڈھول بجنے لگا۔ پھر اسے چیختی ہوئی شہنائی کی آواز بھی سنائی دے گئی اور کسی کی گرم گرم سانسیں اسے اپنی گردن پر محسوس ہونے لگیں۔ وہ ٹرپ کر پلٹا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ یکا یک اسے خیال آیا کہ اگر بیگماں اسے یوں بوکھلاتا ہوا دیکھ لیتی تو کتنے زور سے قہقہہ مارتی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ اس کے سوٹ کیس میں بی۔ اے کا ڈپلوما رکھا ہے اور وہ انگریزی کا معلم ہے اور جناب صرف ان پڑھ ہمیوں ہی کی تاک میں رہتے ہیں۔ ذرا سا سنبھل کر اس نے

کوٹ کی جیب میں سے کنجی نکالی اور آگے بڑھا مگر ابھی میراثیوں کے آنگن میں مڑا ہی تھا کہ بیگماں کا دروازہ کھلا اور ساتھ ہی خوشبو سے لدا ہوا ایک جھونکا یونس پر امڈ پڑا، بیگماں کی آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔

''میں کون؟''

''ماسٹر یونس!'' اس نے جواب دیا۔

''ہم تو ڈر گئے تھے۔'' بیگماں بولی۔ ''ہم سمجھے کوئی چور ہے یا کوئی جن ہے۔ دبے پاؤں کیوں چل رہے ہیں؟ جوان آدمی ہو۔ جوانوں کے قدموں میں تو بڑی دھمک ہوتی ہے۔''

وہ ذرا سا رکا مگر اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ پھر خود بیگماں ہی نے کواڑ بھیڑ لئے تو اس نے بڑھ کر اپنے کوٹھے کے تالے کو پکڑ لیا۔ تالا برف کا گولا ہو رہا تھا اس نے جلدی سے کنجی گھمائی اور کواڑ کھولے۔ ایک کواڑ کے قلابے میں سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی آدمی بولا ہے۔ ''آیئے''

وہ لرز کر رہ گیا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ کہیں بیگماں دروازے کو نیم وا کر کے اس کا مطالعہ نہ کر رہی ہو اور اس خاموش رات میں تو اس کا قہقہہ ساری دنیا میں گونج جائے گا۔ کوٹھے میں داخل ہوتے ہی اس نے دیا سلائی جلائی اور اس کا اتنا بڑا دولتا ہوا سایہ فرش، دیوار اور چھت پر پھیل گیا۔ لالٹین جلا کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور پلنگڑی پر گر پڑا، مگر یوں کود کر اٹھ بیٹھا جیسے مست الست کی میت پر گرا تھا۔ سگرٹ جلا کر وہ ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا سایہ دروازے پر سے یوں بار بار گذر جاتا تھا جیسے پہرہ دے رہا ہے۔ پھر سوٹ کیس کھول کر ایک کتاب نکالی اور پلنگڑی پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اسے محسوس ہوا جیسے اس کے چاروں طرف کوئی لمبی لمبی سانسیں لے رہا ہے اور جیسے سکار کے اندر پھٹے ہوئے ڈھول پر کسی نے ہاتھ مارا ہے۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور مسکرا کر اپنا سر جھٹک دیا۔ وہ غالب کی ایک غزل گنگنانے لگا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے لالٹین بجھا دی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ وقفے وقفے سے کروٹیں بدلنے کے بعد وہ چت لیٹ گیا اور غالب کی غزل کا یہ مصرع بار بار گنگنانے لگا۔ ع

پرہے سائے کی طرح میرا شبستان مجھ سے

اس کا خوف آہستہ آہستہ دور ہونے لگا اور وہ سو گیا۔

نیند میں اسے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی اس کا لحاف کھینچ رہا ہے۔ اس کی آنکھ کھل گئی یہ محسوس کر کے اسے بڑا اطمینان ہوا کہ لحاف کا آخری سرا وہیں اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہے جہاں سوتے وقت تھا اور کمرے میں سوائے اس کے ہوئی نہیں ہے، وہ پھر سے وہی مصرع یوں گنگنانے لگا جیسے اسم اعظم کا ورد کر رہا ہے۔ ع

پرہے سائے کی طرح میرا شبستان مجھ سے

اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے شبستان میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی ہے۔ یہ چاندنی تھی جو دوسرے دروازے کی جھریوں میں

سے لمبی سیدھی تتلیاں بنی فرش پر منقش تھی۔

اچھا تو اتنا بہت سا لولیا تھا کہ چاند جو مشرق سے نکلا تھا۔ آدھا آسمان طے کر کے مغرب کی طرح کھلتے ہوئے دروازے کی جھریوں میں سے جھانکنے لگا تھا۔ تو پھر اب صبح تو خاصی قریب ہوگی۔

اچانک چاندنی کی تتلیاں بجھ گئیں۔ مگر پھر چمک اٹھیں اور یونس کو یقین ہو گیا کہ اس کے دروازے کے سامنے سے کوئی گذرا ہے، کون گذرا ہے؟ اس وقت کون ہے جسے یہاں سے گذرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دروازے کی جھریوں کا ایک بڑا حصہ پھر سے بجھ گیا اور بجھا رہ گیا وہ چیخ اٹھا۔ ''کون ہے؟'' سایہ ہٹ گیا اور یونس نے لپک کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ ''آیئے۔'' دروازے بولا اور چاندنی جیسے کواڑوں کا بند توڑ کر اندر ابل پڑی۔ یونس نے آہستہ سے باہر قدم رکھا اور یوں بولا جیسے اپنے قریب ہی کھڑے ہوئے کسی غیر مرئی وجود سے سرگوشی کر رہا ہے۔ ''کون ہے؟''

کوئی جواب نہ پا کر وہ گلی میں آیا۔ بیگماں کوڈیوڑھی کے بند دروازے کو دیکھا گلی میں جھانکا پلٹتے ہوئے اس نے ذرا دائیں ہو کر میراثیوں کے گھروندوں پر نظر ڈالی جو قبروں کی طرح ایک دوسرے میں گھسے ہوئے کھڑے تھے۔ ''عجیب بات ہے۔'' اس نے زیر لب کہا اور کوٹھے میں آ کر دروازہ بند کرتے ہوئے رک گیا دروازہ کھلا رہنے دیا اور پلنگڑی پر دائیں کروٹ کو لیٹ کر دروازے میں سے باہر دیکھنے لگا۔

اسے منشی اللہ یار یاد آ گیا۔ اگر وہ بانو سے پیار کرتا ہے تو اس کا اظہار کیوں نہیں کرتا؟

بانو واقعی بڑی پراسرار عورت ہے۔ اچٹتی نظر سے دیکھو تو دوسری نگاہ ڈالنے کی طلب ہی محسوس نہ ہو جو ذرا غور سے دیکھ لو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ اس کے نقوش تکمیل کی انتہائی تفصیلوں تک مکمل ہیں۔ مگر کھلی خشک میلی لٹیں دھجیوں کی طرح لٹک لٹک کر آنکھوں اور منہ میں پڑ رہی ہیں۔ کرتے میں کوئی چار جگہ تو پیوند لگے ہیں۔ اس کے ہاتھ کتنے میلے ہیں اور میلے ہیں تو کھردرے بھی ضرور ہوں گے۔ پاؤں بالکل حیوانوں کے سے ہیں۔ پھیلے ہوئے پنجے اور پھٹی ہوئی ایڑیاں، پھر وہ ان کڑاکے کے جاڑوں میں بھی ننگے پاؤں رہتی ہے۔ اس کا رنگ یقیناً صاف ہوگا۔ اس کی گردن سے ذرا نیچے کا حصہ جو کرتے کے بٹن کے قریب نظر آیا تھا کتنا صاف تھا۔ چاندنی کا سا۔ یہی اس کا اصل رنگ ہو گا۔ چہرے کا میلا سانولا رنگ اس کا اصل رنگ نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ دو تین دن تک انگریزی صابن کی ایک بٹی ہی لا دے۔ محبت کرنے والوں کرنے والوں کی یہ قسم بھی عجیب ہوتی ہے کہ فراق محبوب میں زار زار رو لیں گے۔ مگر محبوب پر ایک اکنی خرچ کرنے کی انہیں توفیق نہیں ہوگی۔ یونس نے سوچا۔ کل وہ منشی اللہ یار کی محبت کو غیرت دلائے گا۔ مگر وہ تو کہتا ہے کہ بانو کو وہ آخر دم تک نہیں بتائے گا کہ وہ اس سے پیار کرتا ہے۔ اس لئے کہ اب صرف اللہ یار محرومی کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ پھر بانو بھی اسی جہنم میں جھونک دی جائے گی۔ کیونکہ دونوں کو معلوم ہوگا کہ۔۔۔ ''ہم'' منشی اللہ یار نے کہا تھا۔ ''ہم سماجی مقامات کے کھونٹوں کے ساتھ کتوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں اور ہم زنجیر توڑ کر بھاگیں گے تو آوارہ کہلائیں گے۔''

یہ کیسی عجیب رٹی رٹائی کتابی محبت ہے! یونس نے سوچا اور ادھر منشی اللہ یار ہر سال ایک نئے بیٹے کا باپ بھی بن جاتا ہے اور یہ بھی

دیکھتا رہتا ہے کہ بانو دوسری میراثنوں کے ساتھ صرف ایک دونی چونی کے لئے دن بھر ڈھولک کوٹتی ہے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتی ہے اور جب دلہن کی آمد کے بعد سب میراثنوں کے ساتھ چند پیسوں کی خاطر بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلائے۔ دلہا کے باپ کا تعاقب کرتی ہے تو اس کے جسم کے تناسب کے مقابلے میں اس کا غیر متناسب انداز کتنا بھونڈا، کتنا چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ ''مگر بے چاری کرے بھی تو کیا کرے!

منشی اللہ یار نے کہا تھا۔ ''اگر میں اسے ہر مہینے پانچ دس روپیہ دے دیا کروں تو میری بیوی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ مگر بانو کی پھوپھی تو اس سے پوچھے گی کہ یہ دست غیب کا گر تو نے کس مردوے سے سیکھا اور اس کی پھوپھی کو یقین ہے کہ بانو چڑیل ہے۔ صرف اس کے پاؤں پچھلی طرف مڑنے سے رہ گئے ہیں۔ وہ کہتی ہے، مست الست کو یہی چڑیل نچوڑ کر پی گئی۔ وہ اسے گالیاں دیتی ہے اور کوستی ہے۔ مگر ساتھ ہی اسے بہلاتی بھی کہ اگر بانو کہیں ادھر ادھر ہوگئی تو کہیں وہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے محتاج نہ ہو جائے۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوں اور کڑھتا ہوں اور خون جگر پیتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہوں یونس صاحب۔''

منشی اللہ یار کی باتیں یاد کر کے یونس کو ہنسی آ گئی، عجیب بودا عشق ہے!

چاندنی میں کوئی گلی کی طرف سے آیا اور بیگماں کے بند دروازے کے پاس رکے بغیر اندر چلا گیا تو کیا بیگماں کا دروازہ کھلا تھا!

وہ جوتے پہنے بغیر باہر لپکا اور میراثیوں کے گھروں کو بیگماں کے گھر سے جدا کرتی ہوئی پست حد بندی کے پاس جا کر اس نے دیکھا کہ بیگماں ایک آدمی کے ساتھ صحن کو طے کر کے دروازے تک پہنچی پھر اس نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کے بالکل سامنے ایک دیا جل رہا تھا۔ دونوں اندر چلے گئے، دروازہ بند ہو گیا اور دیا بجھ گیا۔

وہ دروازے کو اتنی دیر تک گھورتا رہا کہ دروازے میں حرکت پیدا ہوگئی اور جس حد بندی پر وہ کہنیاں رکھے کھڑا تھا۔ وہ نیچے دھنسنے لگی، پیچھے ہٹ کر اس نے سر جھٹکا۔ واپس اپنے کوٹھے میں آیا تو اس کی سانس پھول رہی تھی اور جسم کانپ رہا تھا، پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی اس کے کھلے دروازے کے سامنے سے شپ سے نکل گئی ہے۔ یونس چونکا مگر پھر آنکھیں ملتے ہوئے پلنگڑی پر گر پڑا۔

کاش منشی اللہ یار کہیں آس پاس ہوتا تو وہ اس سے لپٹ جاتا۔

یونس صبح کو منشی اللہ یار کے ہاں چائے پینے گیا تو اسے رات کا سارا واقعہ سنایا۔

''اونچا سا قد تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں!'' یونس بولا۔

''بڑا سا طرہ تھا؟'' منشی اللہ یار نے دوسرا سوال پوچھا۔

''نہیں تو۔'' یونس نے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں ننگے سر تھا۔ پگڑی شاید اس نے بغل میں دبا رکھی تھی۔''

''پگڑی بغل میں ہو تو طرہ سر پر نہیں ہوتا۔'' منشی اللہ یار کو دل لگی سوجھی۔ پھر بولا۔

''راجہ ہوگا۔''

''راجہ؟'' یونس حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں ہاں۔'' وہ بولا۔ ''آ گیا ہوگا پردیس سے۔ چھوٹے بھائی کو کہیں نوکر کرانے گیا تھا۔ بیگماں کو معلوم ہوگا کہ راجہ واپس آ رہا ہے۔ اسی لئے تو وہ اتنی چہک رہی تھی۔ میں نے کہا تھا نا۔ بیگماں کو گمراہ کہا جا سکتا ہے اسے بدمعاش یا آوارہ کہنا مشکل ہے۔ بس وہ عشق ایسے دھڑلے سے کرتی ہے کہ آوارہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کا شوہر اس کے انہی تیوروں ست تنگ آ کر کہیں بھاگ گیا ہے۔ بیچارے پارچہ بان ہیں۔ پھر جگہ جگہ کپڑے کے کارخانے لگ گئے تو کھڈی توڑ کر ہل بنا لیا اور مزارعت شروع کر دی۔ سال بھر کا غلہ کما لیتے تھے۔ راجے سے بیگماں کی آنکھ وہیں کہیں کھیتوں میں لڑی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک دن شوہر نے جو بیگماں کی آنکھ وہیں کہیں کھیتوں میں لڑی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک دن شوہر نے جو بیگماں پر فدا تھا، بیگماں کے تھپڑ دے مارا۔ تھپڑ مار کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر منہ لپیٹ کر گھر سے نکلا اور دو ڈھائی سال ہونے کو آئے ہیں پلٹ کر نہیں آیا۔ کہتے ہیں ادھر بلوچستان کی طرف سے ایران کی سرحد پار کر گیا۔ پچھلے سال اس گاؤں کا ایک آدمی خشکی کے راستے حج کرنے گیا تھا۔ اس نے آ کر بتایا کہ بیگماں کا شوہر اسے زہدان میں سڑک کے کنارے ایک پٹرول پمپ کے پاس ایک میلا چھتھڑا ہاتھ میں لئے کھڑا نظر آیا تھا۔ واللہ اعلم۔ ادھر راجے کے عشق کا چرچہ ہوا تو بیگماں کا بھائی اللہ نواز تبر ہاتھ میں لئے بہن کے گھر آیا اور قیامت مچا دی۔ پھر جب بیگماں نے اسے رو رو کر یقین دلایا کہ یہ سب دشمنوں کی کارستانی ہے تو اب اللہ نواز نے بہن کی خاطر سارے گاؤں سے لڑائی مول لے رکھی ہے۔ بیگماں کی چال ڈھال میں اسی لئے تو یہ بلا کا ٹھسا ہے۔ میدان صاف دیکھ کر بڑے بڑوں نے قسمت آزمائیاں کی ہیں مگر بیگماں نے سب کو ٹھوکر پر اٹھا کر یوں اچھالا ہے کہ سب منہ کے بل گرے ہیں۔ اب یہ سب لوگ بیگماں کے جانی دشمن ہیں۔ مگر بیگماں ہے کہ چتون پر بل ہی نہیں آنے دیتی۔ اپنی لگن میں مگن ہے۔ چار پانچ سال پہلے لڑکا ہوا مگر مر گیا۔ پھر شوہر بھی چلتا بنا۔ جب سے اکیلی ہے مگر اکیلی معلوم نہیں ہوتی۔ اکیلے تو ہم جیسے ہوتے ہیں کہ گھر میں بیوی ہے، بچے ہیں۔ مگر باہر گلی میں آؤ تو جیسے پنجرے میں سے نکلے ہوں۔''

منشی اللہ یار ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور پھر بولا۔ ''آپ بیگماں کی پروانہ کیجئے۔ اپنے کام سے کام رکھئے۔ آپ کو کیا اس کے پاس کون آیا کون گیا۔''

''مجھے کیا!'' یونس نے جیسے احتجاجاً کہا۔

''وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کو کیا۔ گھورے پر پھول کھلے یا گدھا لوٹے۔ آپ کو کیا!''

منشی اللہ یار نے یونس سے عمر میں ایک سال بڑا ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ''بانو کیسی ہے؟''

''میں نے تو اسے کل کھیتوں کے بعد سے اب تک نہیں دیکھا۔'' یونس نے جواب دیا

منشی اللہ یار فوراً بولا۔ ''ڈاکٹر اقبال صاحب تو کہہ گئے ہیں کہ ع

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔''

یونس مسکرا کر بولا۔ ''تو پھر دیکھ۔''

مگر منشی اللہ یار رنجیدہ سا ہو گیا۔ پھر یونس نے اس خوف سے وہاں سے اٹھ جانا چاہا کہ کہیں وہ کل کی طرح اس سے لپٹ کر رونے

نہ لگے۔

وہ اٹھا مگر پھر بیٹھ گیا۔ ''یار صاحب، رات کو میں نے جنات کو خوب چکر دیئے اور خوب مزے سے سویا مگر۔۔۔۔''

''میں نے تو جان بوجھ کر جنات کر ذکر نہیں چھیڑا تھا۔'' منشی اللہ یار نے ایک بار پھر اپنے بڑے پن کا مظاہرہ کیا۔

سنئے تو۔ میں سویا تو خوب مزے سے مگر آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک یار ایک سایہ میرے دروازے کے سامنے سے گذرا، دوسری بار یہ سایہ میرے دروازے کے سامنے یوں رک گیا جیسے جھریوں میں سے جھٹک رہا ہے۔ میں فوراً باہر آیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔''

''راجہ اس سے پہلے بیگماں کے ہاں آیا یا بعد میں؟'' منشی اللہ یار نے تفتیش شروع کی۔

''بعد میں'' یونس نے جواب دیا۔

''تو پھر وہ بیگماں ہوگی۔'' منشی اللہ یار بولا۔ ''آپ نئے نئے آئے ہیں نا۔ اس لئے وہ جائزہ لیتی پھرتی ہوگی کہ کہیں کوئی جاگ تو نہیں رہا۔ ٹوٹتی راتوں کو تو کتے بھی سو جاتے ہیں۔ اس لئے کم بختوں نے ملاقاتوں کا بڑا مناسب وقت چن رکھا ہے۔ مگر بیگماں کو آپ کا کیا اعتبار یقیناً بیگماں ہوگی۔''

''وہی ہوگی۔'' یونس بولا۔

تفریح کے وقفے میں منشی اللہ یار کے ہاں کھانا کھا کر یونس مفلر لینے کے بہانے گھر چلا آیا۔ بیگماں کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے پلٹ آنا چاہا۔ مگر جب تک وہ پلٹنے کا فیصلہ کرتا اپنے صحن میں مڑ آیا تھا۔ بوڑھی نوراں چھپر کے قریب پیڑھی پر بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے حقہ پی رہی تھی۔ یونس کو دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ ''ایلو میں ابھی ابھی سوچ رہی تھی کہ میرا منشی آئے تو پوچھوں کیا تیرے پاس جوڑوں کے درد کی کوئی گولی ہے۔ اے میں صدقے تو تو خضری عمر پائے گا۔ اللہ اقبال بڑھے۔ اللہ ترقیاں دے۔''

''گولی تو ہے خالہ۔'' یونس بولا۔ مگر جوڑوں کے درد کی نہیں سر کے درد کی ہے۔''

''اے بسم اللہ، پہلے درد کا پٹاخہ سر میں ہی تو چھوٹتا ہے۔'' نوراں نے اپنے سوکھے لمبے بازو اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ ''جوڑوں میں یہ درد سر کے راستے ہی تو اترتا ہے۔ میں تو صبح سے کٹے ہوئے گوشت کے ڈھیر کی طرح پڑی ہوں۔ بجھا حقہ پی رہی ہوں۔

اٹھ کر ٹوپی میں ایک چنگاری تک نہیں رکھ سکتی، اور وہ کتیا کی اولاد بانو اکنی کی نسوار خریدنے گئی ہے تو وہیں کی ہو کر رہ گئی ہے اے تیرے بچے جئیں ایک گولی نکال دے۔''

''ایک گولی مجھے بھی منشی جی۔'' بیگماں کی آواز آئی اور یونس ہڑبڑا کر پلٹا۔ بیگماں کھلے لمبے بالوں کا ایک ڈھیر سینے اور کندھوں پر بکھیرے دروازے میں کھڑی تھی۔ مگر اس سے خوشبو نہیں آ رہی تھی۔

''تجھے کیا ہوا خوشبو! خوشبواں بیگم؟'' نوراں نے پکارا

''اے خالہ!'' بیگماں بولی۔ میں نے کہا آج سر دھولوں۔ سر دھو کر بال سکھانے دھوپ میں بیٹھی۔ بال تو سوکھ گئے مگر سر پکڑا گیا

ہے۔"

"خوشبو بھی تو پکڑتی ہے سرکو۔" نوراں بولی اور بیگماں ہنسنے لگی۔

یونس نے تالا کھولا اندر جا کر گردن میں مفلر ڈالا۔ اسپرو کی تین گولیاں نکالیں، تالا بند کر کے اس نے ایک گولی نوراں کو دی اور پھر بیگماں کی طرف بڑھا۔ اس کے جسم میں سے اتنی بہت سی ٹھنڈی اور گرم لہریں یک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرنے لگیں کہ وہ سمجھا بیگماں تک پہنچتے پہنچتے وہ کٹ کر ڈھیر ہو جائے گا۔ جب اس نے بیگماں کے ہاتھ پر دو گولیاں خاصے فاصلے سے ٹپکائیں تو اسے بیگماں دکھائی ہی نہ دی۔ پھر نہ جانے اس نے کیسے کہہ ڈالا۔ "ایک کھالو ایک رکھ لو پھر کبھی کام آجائے گی۔" یہ کہہ کر وہ گلی میں شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا سا نکل گیا۔ پھر اس نے بوڑھی نوراں کی آواز سنی وہ بیگماں سے پوچھ رہی تھی۔ "کیا کہہ رہا تھا تم سے؟"

یونس سن سے رہ گیا۔ بیگماں کو ایک فالتو گولی دے کر جیسے اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ کر ڈالا تھا۔

بیگماں کی آواز آئی۔ "کہہ رہا تھا گولی پانی سے کھانا۔"

تو کیا بیگماں کو معلوم تھا کہ اسپرو کی دوسری گولی میں یونس کی محبت اور ناموس دونوں سمٹ آئے ہیں!

یونس نے پلٹ کر بیگماں کی طرف دیکھا تو وہ تالی بجا کر اس زور سے ہنسی کہ یونس وہاں سے تقریباً بھاگ نکلا۔

وہ گھر کی طرف آتی ہوئی بانو کے قریب سے بھی زن سے گذر گیا اور سکول میں پہنچ کر بچوں کو ایسے ایسے لطیفے سنائے کہ وہ لوٹ پوٹ ہو کر رہ گئے۔

سانپ اگر زہریلا نہ ہوتا تو بچوں کا نہایت محبوب کھلونا ہوتا کوئی بڑے سے بڑا بقراط قسم کا بچہ بھی اس کی منقش جلد اس کی بے آواز رفتار اور اس کے لہراؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ مگر سانپ کے زہر نے اسے ایک مردود مخلوق بنا دیا ہے۔ یونس کبھی سانپ کے پھن سے بے پرواہ ہو کر آگے بڑھتا اور کبھی اس کی دوشاخہ زبان دیکھ کر کانپ جاتا۔ وہ کبھی اس کی جلد پر سے کوڑیاں اٹھا لینے پر آمادہ ہو جاتا اور کبھی اس کی پھنکار سے ڈر کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیتا۔ وہ بیگماں کو بائیں کندھے سے چوکھٹ کا سہارا لئے اور صرف بائیں ٹانگ پر زور دیئے سیاہ کپڑوں میں ملبوس کھڑا دیکھتا تو بیگماں کے چہرے اور ہاتھوں سے نکلتی ہوئی شعاعیں اسے اپنے ہالے میں جکڑ لیتیں۔ لمبی لمبی بڑی بڑی بادامی آنکھوں کی روشنی اسے اپنی گرفت میں لے لیتی۔ اور وہ گلی میں داخل ہوتے ہی مسمریزم ماسٹروں کے معمول کی طرح یوں بے ارادہ قدم اٹھانے لگتا جیسے بیگماں کے دروازے کے سامنے سے دائیں طرف اپنے کوٹھے کا رخ نہیں کرے گا بلکہ بیگماں کے سامنے رک جائے گا۔ رو پڑے گا۔ اس سے لپٹ جائے گا۔ مگر جب رات آخری دموں پر آتی اور اس کے دروازے کے سامنے سے سائے ادھر سے ادھر کئی بار گذر چکے ہوتے اور جھریوں میں سے جھانک چکے ہوتے اور رات بھر کے جاگے ہوئے لوگ بھی سو چکے ہوتے تو راجے کے انتظار میں پھنکا ہوا یونس دیکھتا کہ راجہ آتا۔ وہ سیدھا بیگماں کی ڈیوڑھی میں داخل ہو جاتا، پھر بیگماں اسے اپنے کوٹھے میں لے جاتی۔ کوٹھے کے کواڑ کھلتے تو دروازے کے بالکل سامنے ایک دیا ان دونوں کے سایوں کے خطوط کو واضح کر دیتا۔ پھر کواڑ بند ہو جاتے، دیا بجھ جاتا۔ رات سناٹے کے شکنجے میں آجاتی۔ سارا گاؤں دم سادھ لیتا اور یونس کا جی چاہتا کہ وہ بیگماں کے صحن سے اس کے صحن کو جدا کرتی ہوئی ذرا سی دیوار

کو پھاند جائے اور اس کے کوٹھے کے بند کواڑوں پر زور سے تھوک دے اور پوری قوت سے چلا کر کہے۔ ''بدذات، بدمعاش، بدچلن۔''

پھر اس کا رونے کو جی چاہنے لگتا۔

صبح ہو جاتی، بانو سر پر مٹی کا ایک برتن رکھے اڑوس پڑوس سے لسی جمع کرنے چلی جاتی۔ بوڑھی نوراں ایک ہاتھ میں حقہ اور دوسری میں پیڑھی لئے دھوپ میں چلی جاتی۔ مرغیاں مرغے ڈربوں سے نکل کر گھوروں کی طرف یوں لپکتے، جیسے رات وہاں ان کے لئے کوئی غیبی ہاتھ اناج کی مٹھیاں بکھیر گیا ہے۔ میرا ثنیں اپلوں کے لئے گوبر جمع کرنے نکل جاتیں۔ ان کے ٹھٹھرے ہوئے بچے یونس کے کوٹھے میں جھانکتے ہوئے اپنی ماؤں بہنوں کے بتائے ہوئے کاموں پر روانہ ہو جاتے، کوئی دھواں چھوڑتے ہوئے اپلے پر ایک انگارہ رکھے واپس آتا۔ کسی کے بازوؤں میں چولھا گرم کرنے کے لئے باجرے کے سوکھے ٹانڈے ہوتے، کوئی لسی سے بھرے ہوئے پیالے کو مارے احتیاط کے چھلکاتا ہوا ننھے ننھے قدم اٹھاتا یونس کے سامنے سے گذر کر غائب ہو جاتا۔ جس روز راجہ بیگماں کے پاس آتا۔ اس روز وہ بہت دیر سے اٹھتی۔ یا کم از کم یونس کو وہ تفریح کے وقفے سے پہلے تک دکھائی نہ دیتی۔ لیکن جس روز وہ نہ آپاتا بیگماں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ڈیوڑھی کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی۔ اس کے بالوں کا ڈھیر اس کے کندھوں اور سینے پر بکھرا ہوتا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسا کر انہیں الٹا کرتی اور بازوؤں کو سر پر لے جا کر جب لمبی لمبی انگڑائیاں لیتی تو کالے کرتے کی کھلی آستینیں اس کے کندھوں پر گر پڑتیں اور اس کے سڈول بازو چمک اٹھتے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ آئی دروازے پر کھڑی رہی اور یونس کے کوٹھے کی طرف دیکھے بغیر اندر چلی گئی۔ لیکن جب بھی وہ یونس کی طرف دیکھتی یونس اس کی طرف بڑی بے حیائی سے دیکھ رہا ہوتا اور وہ تالی بجا کر اور قہقہہ مار کر اندر چلی جاتی۔

ایک بار وہ قہقہہ مار کر اندر جانے والی ہی تھی کہ ادھر سے بانو لسی کا برتن سر پر رکھے آ گئی اور بولی۔ ''کیا بات ہو گئی بیگماں؟''

اور ہنستی ہوئی بیگماں نے یونس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہہ دیا۔ ''کچھ نہیں بانو۔ منشی جی کو دیکھ کر ہنسی آ گئی تھی کہ اکیلا چاہے آدمی ہو چاہے چڑا، کیسا لٹا لٹا لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے اٹھا کر سامنے بٹھا لو اور کہانی سنانے لگو۔''

پھر وہ زور سے ہنستی ہوئی اندر بھاگ گئی اور بانو میلے سانولے چہرے پر دھول سی اڑاتی ہوئی سیدھی یونس کے دروازے پر آ کر بولی۔ ''سنا منشی جی، بیگماں کیا کہہ رہی تھی؟''

یونس ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ بیگماں کی بات سن کر خوش ہو یا خفا ہو۔ اس لئے خالی خالی آنکھوں سے بانو کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کوئی بات نہیں، پڑوسن ہے اس کا حق ہے جو چاہے کہہ لے۔''

''پڑوسن تو ہے'' بانو بولی اور چلی گئی۔

پھر یکا یک یونس کو خیال آیا کہ اس نے متوازن بات نہیں کی۔ بات کو واضح کرنے کے لئے وہ فوراً باہر آیا۔ بانو اپنے کوٹھے میں داخل ہو رہی تھی اور بوڑھی نوراں پیڑھی اور حقہ لئے دھوپ میں بیٹھنے آ رہی تھی۔ ''رد بلائیں دور بلائیں۔'' وہ بولی اور یونس کو واپس اپنے کوٹھے میں آ گیا۔

اس روز منشی اللہ یار بار بار یونس کو یاد دلاتا رہا کہ اس کی صحت خراب ہو رہی ہے اور اسکی آنکھیں سوجی رہتی ہیں اور اس کے ہونٹ

تک زرد پڑتے جا رہے ہیں۔اس نے مست الست کے کوٹھے کے آسیب تک کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر دو ایک روز میں اسے نیا مکان نہ ملا تو وہ بال بچوں کے اپنے گاؤں بھیج کر یونس کو اپنے ہاں لے آئے گا۔''یہ بھی کوئی بات ہے۔''اس نے کہا۔''میں وہمی آدمی نہیں ہوں۔لیکن یہ جنات کی کارستانی نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ آئے تھے تو سرخ انار ہو رہے تھے اور اب کل ایک مہینے بعد یوں معلوم ہوتا ہے۔جیسے آپ سکول میں نہیں ہیں، ہسپتال میں ہیں۔''

رات یونس نے بڑے اضطراب میں گذاری، لالٹین کی روشنی میں پڑھنے کی بھی کوشش کی۔مگر آج اس کا جی نہیں لگ رہا تھا۔چاند کی چودھویں تھی مگر اس کے دروازے کا رخ مغرب کو تھا۔اس لئے چاندی بہت دیر تک اس کے کواڑوں کی جھریوں میں سے نہ جھانکی، منشی اللہ یار سے آسیب کا ذکر سن کر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج وہ اس سائے کو ضرور پکڑے گا، جو قریب قریب ہر رات اس کے دروازے کے سامنے سے گذرا، اور کبھی کبھی یوں رکا رہا جیسے اندر جھانک رہا ہے، پھر جب چاندنی تیلیاں سی بن کر اس کے فرش پر منقش ہو گئی تو وہ اٹھا اور آہستہ سے در دروازے کی زنجیر کھول کر واپس پلنگڑی پر آ بیٹھا۔اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ادھر سایہ اس کے دروازے کے سامنے سے گذرے گا۔ادھر وہ لپک کر کواڑ کھولے گا اور اسے دبوچ لے گا اور شور مچا دے گا۔آسیب سے مقابلے کا جذبہ اتنا شدید ہو رہا تھا کہ سکار کھول کر اور اندر ہاتھ لے جا کر اس نے پھٹے ہوئے ڈھول پر بھی ایک ہاتھ مار دیا اور شہنائی بھی جھولی۔

وہ بہت دیر تک بیٹھا دروازے کو دیکھتا رہا۔چاندنی کی تیلیاں بہت لمبی ہو گئیں مگر سایہ غائب رہا۔ایک بار وہ باہر نکل کر صحن میں بھی گھوم آیا۔واپس آ کر کواڑ بھیڑ دیئے اور ٹہلنے لگا۔اسے بے چینی سی ہونے لگی، پھر یکا یک اسے باہر بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔آہستہ سے کواڑ کھولے تو دبا دبا شور واضح ہو گیا۔پست دیوار کے پاس جا کر اس نے بیگماں کے گھر میں جھانکا، پانچ چھ آدمی بیگماں کے کوٹھے کے دروازے پر جمع تھے۔دروازے کا رخ مشرق کو تھا۔اس لئے وہاں اندھیرا تھا۔پھر دروازے پر کسی نے دو بار ہاتھ مارا اور آواز آئی۔دونوں سن لو۔بیگماں اور راجے تم دونوں سن لو کہ آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔ہم اللہ نواز کو بلانے جا رہے ہیں۔تا کہ اپنی بہن کا بندوبست وہ خود کر لے۔جب تک وہ آتا ہے تم جو چاہو کر، اس کے آنے کے بعد تو اس کی تبر ہو گی اور تمہاری گردنیں ہوں گی۔غضب خدا کا۔چٹی چاندنی میں بدمعاشیاں ہو رہی ہیں۔گاؤں کے گاؤں کو پلید کر ڈالا ہے۔تمہاری حفاظت کے لئے ہم نے باہر سے کنڈا لگا دیا ہے۔جب تک مزے کرو۔''پھر وہ ہنسا اور چاندنی میں کھڑے ہوئے لوگوں کے پاس آ گیا۔

یونس نے کان دھر کر سنا اندر کوئی جواب نہ آیا۔بیگماں اکیلی ہوتی تو یقیناً کڑک کر جواب دیتی، تو پھر راجہ بھی اندر ہی ہے اور دروازہ باہر سے بند ہے اور ایک دوسرے میں گھس کر کھسر پھسر کرتے ہوئے آدمیوں سے ایک آدمی کٹ کر ڈیوڑھی کی طرف جا رہا ہے وہ یقیناً اللہ نواز کو بلانے جا رہا ہو گا۔

یونس دیوار سے ہٹ آیا اور جب وہ آدمی گلی میں نکل گیا تو یونس اپنے کوٹھے کے دروازے کے پاس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔یکا یک وہ تڑپ کر اٹھا۔میراثیوں کے چھپر میں سے ایک لمبی سی لکڑی کھینچی اور باہر گلی میں بھاگ نکلا۔گھوم پھر کر وہ بیگماں کے کوٹھے کے پچھواڑے تک پہنچ گیا اور کچی دیوار پر بھاری لکڑی کی ضربیں لگانے لگا۔دھم دھم کی یہ آواز مسلسل رات کے سناٹے میں گونجا گئی اور بیگماں کے صحن میں

کھڑے لوگ یہ سوچ کر کوٹھے کے پچھواڑے کی طرف بھاگے کہ راجہ اور بیگماں دیوار میں نقب لگا کر بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بہت سے قدموں کی دھب دھب سن کر یونس لکڑی اٹھائے ایک اور گلی میں نکل گیا اور پھر لکڑی وہیں پھینک کر سرپٹ بھاگا۔ بیگماں کے پچھواڑے کی گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا کہ لوگ ابھی وہیں جمع ہیں۔ پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنی گلی میں آیا اور بیگماں کی ڈیوڑھی میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ کسی نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے دائیں طرف اپنے کوٹھے کے صحن میں گرا دیا۔ اسے گرانے والا بھی ساتھ ہی گرا وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔

''میں بانو ہوں۔ بانو۔ میں اور کوئی نہیں ہوں۔ میں بانو ہوں۔'' بانو نے اٹھتے ہوئے کہا، اکھٹے بہت سے بھاگتے ہوئے آدمیوں کے قدموں کی آواز قریب آنے لگی تو بانو یونس کو ہاتھ سے پکڑا اور اسے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے کوٹھے میں لے آئی۔ پھر لوگ ادھر بیگماں کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ ادھر بانو نے یونس کے کوٹھے کا دروازہ بند کر دیا اور وہ یونس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہانپتی ہوئی بولی۔ ''فکر نہ کرو منشی جی، جب تم چھپر سے لکڑی کھینچ کر بھاگے تو میں جانتی تھی کہ تم کہاں جا رہے ہو، پھر جب لوگ دھم دھم سن کر باہر لپکے تو میں نے جا کر بیگماں کے دروازے کا کنڈا کھول دیا اور اسے بتا دیا کہ یہ میں منشی جی کا کام کر رہی ہوں جو پچھواڑے میں تمہاری دیوار کوٹ رہا ہے۔ میں وہاں سے راجے کو نکال کر باہر سے کنڈا لگا آئی ہوں۔ اب اللہ نواز آئے گا تو کوٹھے میں بہن کو اکیلا دیکھ کر وہ بیگماں سے کچھ نہیں کہے گا۔ اب تو اس کی تبران لوگوں پر اٹھے گی جن پر بیگماں نے سو بار تھوکا ہے اور آج اس سے بدلہ چکانے آئے ہیں۔''

بوکھلائے ہوئے یونس نے ایک لمبی سانس لے کر بانو کی طرف دیکھا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سمجھے اور کچھ سمجھے بغیر بولا۔ ''تم تو بڑی اچھی نکلیں بانو!''

لالٹین کی روشنی میں بانو حیران سی ہو کر یونس کو بت بٹ دیکھنے لگی۔ پھر وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور یونس سے چمٹ گئی۔ وہ اپنا چہرہ اس کے سینے پر رگڑتی رہی۔ اس کی گردن چومتی رہی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر انہیں کھینچتی رہی اور کہتی رہی۔ ''یوں بھی ہوتا ہے منشی جی، تم بیگماں کو چاہتے ہو، میں تمہیں چاہتی ہوں، تم نے بیگماں کی مدد کرنی چاہی میں نے تمہاری مدد کر دی۔ میں نے تمہاری نیندوں پر پہرے دیئے ہیں۔ میں تو راتوں کو ان کواڑوں کو چومتی پھری ہوں۔ منشی جی، مجھے تو تمہاری ایک ایک گھڑی کا پتہ ہے کہ تم کیا کر رہے ہو اور کہاں دیکھ رہے ہو۔ میں نے ان جھریوں پر کان رکھ کر تمہاری سانسوں کی آوازیں سنی ہیں اور تم مدرسے گئے ہو تو تمہارے قدموں کی خاک اٹھا کر اپنی مانگ میں ڈال لی ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی منشی جی۔ میں تو اب عمر بھر اس ایک پل کو اپنے سینے سے لگائے لگائے پھروں گی۔ تم بے شک بیگماں کو چاہو۔ میں کون ہوتی ہوں تمہیں روکنے والی۔ میں کوئی تمہاری پڑوسن ہوں۔''

بت کی کھڑے ہوئے یونس کے دماغ کی سنسناہٹ گولوں کی طرح پھٹ پڑی اور یونس کے کواڑوں پر ایک ساتھ بہت سے ہاتھ پڑے۔

باہر ایک ہجوم جمع تھا اور بہت سے لوگ بیک وقت بول رہے تھے۔ ''ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ منشی کا دروازہ کھلا تھا اور ہم سامنے سے گذرے تو بند ہو گیا۔ یہ منشی کیا کرتا پھرتا تھا۔ کیوں چھپتا پھرتا تھا۔ ہم کہتے ہیں راجے کو اسی نے بھگایا ہے، ہم اس سے پوچھیں

گے ہم اس کے گلے میں پھندہ ڈال کر پوچھیں گے۔"

"پھندا ڈال کر پوچھنے کی تو خیر تمہیں مجال نہیں۔" ایک اور آواز آئی۔ "مگر تم نے میری بہن کی عزت کو تماشا بنایا ہے تو منشی سے بھی پوچھ دیکھو۔ پھر میری تبر تم سے پوچھے گی۔۔۔۔۔ منشی بھئی دروازہ کھول۔"

"دروازہ کھولو منشی" اللہ نواز پکارا۔

یونس نے پہلی بار بانو کے گرد اپنا ایک بازو لپیٹا اور اس کے بالوں کو چوما۔ پھر وہ بانو کو آہستہ سے الگ کر کے اور اسے پلنگڑی پر بٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا تو باہر سے کسی نے دروازے پر زور کی ایک لات ماری۔ پھر اکٹھے بہت سے آدمیوں نے زور لگایا اور دروازہ چوکھٹ سمیت اکھڑ کر دھڑاک سے یونس کے قدموں میں آن گرا۔

اللہ نواز ہاتھ میں تبر تھامے اندر آیا۔ اور ذرا سا رک جیسے بلند آواز میں سوچا۔ "یہ کون ہے؟" پھر کڑک کر بولا۔ "تو کون ہے؟"۔۔۔ پھر باہر سے لوگوں سے پوچھا۔ "تم نے تو کہا تھا منشی کنوارا ہے پھر اندر یہ عورت کون ہے؟"

لوگوں نے یلغار بول دی۔

پھر پھوٹتی ہوئی پو کے اجالے میں جب عطر کی نہایت تیز خوشبو سے فضا مہک رہی تھی اور بوڑھی نوراں بیسیوں عورتوں میں گھری ہوئی اور گھٹنوں میں سر چھپا کر بیٹھی ہوئی بانو کی پیٹھ پر دوہتڑ مار رہی تھی۔ اور اپنے مست الست کے بین کر رہی تھی۔ منشی اللہ یار ہجوم کو چیرتا ہوا آیا۔ اور یونس کے سامنے ایک لمحے تک چپ چاپ کھڑے رہنے کے بعد ہر لفظ کو چباتا ہوا بولا۔ "یونس صاحب مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔"

یونس یوں تڑ سے گرا کہ خاموشی سے مار کھاتی ہوئی بانو تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑی ہوئی بیگماں یوں بیٹھ گئی جیسے گر پڑی ہے۔ پھر وہ گھٹنوں میں سر چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سورج ابھرنے تک یہ خبر گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم گئی کہ بانو میراثن کے ساتھ پکڑے جانے کے بعد ماسٹر یونس پر جن آ گئے ہیں۔

وحشی

''آ گئی۔'' ہجوم میں سے کوئی بولا اور سب لوگ یوں دو دو قدم آگے بڑھ گئے جیسے دو دو قدم پیچھے کھڑے رہتے تو کسی غار میں گر جاتے۔

''کتنے نمبر والی ہے؟'' ہجوم کے پیچھے سے ایک بڑھیا نے پوچھا۔

''پانچ نمبر ہے۔'' بڑھیا کے عقب سے ایک پنواڑی بولا۔

اور بڑھیا ہڑ بڑا کر ہجوم کو چیرتی ہوئی یوں آگے بڑھنے لگی کہ سب لوگ بس کے بجائے بڑھیا کو دیکھنے لگے۔

''عجیب وحشی عورت ہے۔'' ایک شخص نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ ''لے کے جبڑا توڑ ڈالا۔''

''ابے پاگل ہوئی ہے کیا؟'' ایک اور نے فریاد کی۔

اتنے میں بس آ گئی۔ کنڈکٹر نے کھڑاک سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''پہلے عورتیں۔''

ہجوم کے وسط میں پہنچی ہوئی بڑھیا رک گئی اور ہجوم نے بڑی ناگواری سے دو حصوں میں بٹ کر اسے راستہ دے دیا۔

بڑھیا نے سر پر چادر اٹھا کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر چادر کے ایک پلو کو مٹھی میں پکڑ لیا اور دور و یہ ہجوم پر فاتحانہ نظر ڈال کر کنڈکٹر سے کہنے لگی ''تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے لڑکے۔''

''چل آ بھی مائی۔'' کنڈکٹر نے شرما کر کہا۔

''رستہ تو میں ویسے بھی بنا لیتی۔ آدھا تو بنا بھی لیا تھا پر تو نے جو بات کہی ہے وہ ہزار روپے کی ہے۔'' بڑھیا نے بس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ دوسری سیڑھی کو ہاتھ سے جکڑ کر بیٹھ گئی جیسے بہت بلندی پر پہنچ کر چکرا گئی ہے۔ کنڈکٹر نے اسے تھام لیا۔ ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور دروازے کے سامنے ہی ایک سیٹ پر بٹھا دیا۔ پھر سب لوگ بس میں بھر دیئے گئے۔ اور اس ریلے میں کنڈکٹر بس کے پرلے سرے پر پہنچ گیا۔

بڑھیا نے ذرا سا اٹھ کر سیٹ کو ہاتھ سے ایک دو بار دبایا اور آہستہ سے بولی۔ ''بڑی نرم ہے۔'' بس چلی تو اس نے دائیں طرف دیکھا۔ ایک گوری چٹی عورت، دودھیا رنگ کی صاف ستھری ساڑھی پہنے، سنہری فریم کی عینک لگائے۔ سفید چمڑے کا پرس ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

بڑھیا نے بھی گردن کو ذرا سا کھینچ کر باہر دیکھا۔ ہر چیز پیچھے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ وہ آنکھیں مل کر سامنے دیکھنے لگی پل بھر بعد اس نے گوری چٹی عورت کی طرف دوبارہ دیکھا۔ پھر اپنی انگشت شہادت اس کے گھٹنے پر بجا دی۔ عورت نے بھویں سکیڑ کر بڑھیا کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ''چکر آ جائے گا باہر مت دیکھو''

گوری چٹی عورت مسکرائی اور بولی۔ ''مجھے چکر نہیں آتا۔''

''مجھے تو آ گیا تھا۔'' بڑھیا بولی۔

''تمہیں آ گیا تھا تو تم باہر مت دیکھو۔ مجھے نہیں آتا اس لئے میں تو دیکھوں گی۔'' عورت نے کہا۔

اور بڑھیا نے پوچھا۔ ''تو کیا تم باہر نہیں دیکھو گی تو تمہیں چکر آ جائے گا۔''

عورت کی مسکراہٹ یکا یک غائب ہو گئی اور وہ باہر دیکھنے لگی۔

بڑھیا کو اگلی سیٹ پر ایک عورت کا صرف سر نظر آ رہا تھا اس نے بالوں میں زرد رنگ کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ بڑھیا نے ذرا سا آگے جھک کر پھول کو غور سے دیکھا، پھر انگلی سے اپنی ہمسائی کا گھٹنا بجا کر رازداری سے بولی۔ ''یہ پھول اصلی ہے کہ نقلی؟''

''نقلی ہے!'' عورت بولی۔

''نقلی ہے تو سونے کا ہو گا۔'' بڑھیا نے رائے ظاہر کی۔

''رنگ تو سونے کا سا ہے۔'' عورت نے کہا۔

''مجھے تو اصلی لگتا ہے۔ کسی جھاڑی سے اتارا ہے۔'' بڑھیا بولی۔

''تو پھر اصلی ہو گا۔'' عورت نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے ذرا سا حیران ہو کر گوری چٹی عورت کی طرف دیکھا اور پھر انگلی سے اس کا گھٹنا بجا دیا۔

''کیا ہے؟'' عورت نے بھویں سکیڑ کر پوچھا۔

بڑھیا بولی۔ ''عجیب بات ہے۔ باہر تم دیکھتی ہو اور چکر مجھے آ جاتا ہے۔''

عورت ذرا سی مسکرائی۔

''سنو!'' بڑھیا نے کہا۔

''کیا ہے؟'' عورت نے پھر بھویں سکیڑ لیں۔

''لیڈی ہو؟'' بڑھیا نے سوال کیا۔

''کیا؟'' عورت نے جیسے برا مان کر پوچھا۔

''ہسپتال میں لیڈی ہو؟'' بڑھیا نے وضاحت کی۔

''نہیں!'' عورت بولی۔

''تو پھر کیا ہو؟''

''کیا؟''

''کیا کرتی ہو؟''

''کچھ نہیں کرتی۔''

''کچھ تو ضرور کرتی ہو۔'' بڑھیا نے دائیں بائیں سر ہلا کر کہا۔

''ٹکٹ لے لو مائی۔'' بڑھیا کو اپنے سر کے اوپر سے کنڈکٹر کی آواز سنائی دی۔

''دے دو۔'' بڑھیا نے چادر کے پلو کو مٹھی سے آزاد کر دیا۔

''کہاں جاؤ گی؟'' کنڈکٹر نے پوچھا۔

''گھر جاؤں گی بیٹا۔'' بڑھیا بڑے پیار سے بولی۔

کنڈکٹر زور سے ہنسا۔ گوری چٹی عورت بھی بڑھیا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

کنڈکٹر نے جیسے تمام مسافروں کی مخاطب کر کے کہا۔ ''میں نے مائی سے پوچھا کہاں جاؤ گی۔ بولی۔ گھر جاؤں گی۔''

اب کے مسافروں نے بھی کنڈکٹر کے قہقہے کا ساتھ دیا۔

کنڈکٹر بہت محظوظ ہوا تھا۔ اس لئے بڑھیا کو بڑی نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''گھر تو سب لوگ جائیں گے مائی۔ یہ بتاؤ کہاں کا ٹکٹ کاٹوں؟''

''والٹن کا۔'' وہ بولی۔ ''میرا گھر والٹن کے پار ایک گاؤں میں ہے۔''

مسکراتے ہوئے کنڈکٹر نے ٹکٹ کاٹ کر بڑھیا کو دیا اور بولا۔ ساڑھے پانچ آنے دے دو۔''

''ساڑھے پانچ آنے؟'' بڑھیا نے چادر کے پلو کی گرہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ ''ساڑھے پانچ آنے کیسے؟'' غوثا تو کہہ رہا تھا صرف چار آنے لگتے ہیں۔ اس نے تو مجھے صرف یہ گول چونی ہی دی ہے۔'' اس نے چونی دو انگلیوں کی پوروں میں تھام کر کنڈکٹر کی طرف بڑھا دی۔

کنڈکٹر بولا۔ ''نہیں مائی۔ چار آنے نہیں۔ ساڑھے پانچ آنے لگتے ہیں۔''

بڑھیا کی آواز تیز ہو گئی۔ ''ساری دنیا کے چار آنے لگتے ہیں۔ میرے ساڑھے پانچ آنے لگ گئے؟ کیوں؟ ہڈیوں کا ڈھیر ہوں۔ میرا بوجھ ہی کیا۔ لے یہ چار آنے۔''

''عجیب مصیبت ہے۔'' کنڈکٹر کے تیور بدل گئے۔ اور وہ مسافروں کو سامعین بن کر تقریر کرنے لگا۔ ''میں تو کہتا ہوں ک سرکار کو قانون پاس کرنا چاہیے کہ جو پرائمری پاس نہ ہو بس میں سفر نہ کرے۔ اب اس مائی کو دیکھئے۔ میو ہسپتال کے سٹینڈ پر لیس میں بیٹھی ہے۔ والٹن جا رہی ہے اور کہتی ہے والٹن بھی جاؤں گی اور ساڑھے پانچ آنے بھی نہیں دوں گی۔ اس لئے کہ کسی نے اسے چار ہی آنے دیئے ہیں۔''

بڑھیا بچے کی طرح بولی۔ ''کسی نے کیوں؟ اپنے غوثے نے دیئے ہیں۔''

کنڈکٹر نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے اور اب کے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس لئے کہ غوثے نے اسے صرف چار آنے دیئے

ہیں۔اب اسے کون سمجھائے کہ بس سرکار کی ہے غونٹے کی نہیں ہے۔غونٹے کی ہوتی تو وہ تم سے چار ہی آنے لیتا۔"

"کیوں وہ کیوں لیتا چار آنے؟" بڑھیا بولی۔"وہ تو میرا بھتیجا لگتا ہے۔کماؤ ہے۔روز اپنے ریڑھے پر دودھ لاتا ہے۔آج میں اسی کے ریڑھے پر تو آئی تھی۔چار آنے چھوڑ چار پیسے بھی نہیں مانگے۔اس کی مجال تھی جو مانگتا۔گود میں کھلایا ہے۔اس کی سالی یہاں ہسپتال میں بیمار پڑی ہے۔میں نے کہا چلو اس دیکھ لوں۔اسی ریڑھے پر واپس آجاؤں گی۔مگر آج لڑکی کی حالت اچھی نہیں ہے۔اس لئے غونٹا یہیں رہ گیا ہے۔اور مجھے یہ چونی دے کر کہا ہے کہ گھر چلی جاؤں۔اب تم ساڑھے پانچ آنے مانگ رہے ہو تو یوں کرو مجھے کسی چار آنے والی جگہ پر بٹھا دو۔میں تو کسان عورت ہوں۔نیچے بھی بیٹھ جاؤں گی۔تم کہیں اس نرم نرم گدے کے تو ساڑھے پانچ آنے نہیں مانگ رہے ہو؟"

"نہیں مائی۔" کنڈکٹر نے تنگ آ کر کہا۔"سب سواریوں کے نیچے ایسے ہی گدے ہیں۔"

"ڈیڑھ آنہ اور نکالو۔" کنڈکٹر بولا۔

"کہاں سے نکالوں؟" وہ بولی۔بتا جو رہی ہوں کہ میں گھر سے خالی ہاتھ آئی تھی۔یہ چونی بھی غونٹے نے دی ہے۔گل اسے لوٹا دوں گی۔"

کنڈکٹر صاف طور پر اپنے غصے پر ضبط کر رہا تھا۔بولا۔"مجھے تو آج ہی چاہئے مائی میں تو ٹکٹ کاٹ چکا ہوں۔جلدی کرو۔اتنے بہت سے اسٹینڈ گزر چکے ہیں۔اتنی بہت سو سواریاں جمع ہو گئی ہیں۔سب کے ٹکٹ کاٹنے ہیں۔کوئی چیکر آ گیا تو جان آفت میں کر دے گا۔بھئی لوگو خدا کے لئے اس مائی کو سمجھاؤ۔جانا والٹن ہے اور کرایہ ماڈل ٹاؤن کا بھی نہیں دے رہی ہے۔پھر کہتی ہے چونی سے زیادہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔"

بڑھیا کے سامنے والی سیٹ پر، بالوں میں پھول سجا کر بیٹھی ہوئی عورت نے پلٹ کر کہا۔

"ایسیوں کی تلاشی لینی چاہیئے۔ان کی جیبیں اکنیوں دونیوں سے بھر ہوتی ہیں۔"

بڑھیا اس کے سر کے اوپر چیخ اٹھی۔"کیا تو میرے بیٹے کی گھر والی ہے کہ تجھے میری جیبوں کا حال بھی معلوم ہے۔سر میں کوڑی کا پھول لگا لینے سے بھیجے میں عقل نہیں بھر جاتی۔بی رانی۔"

پھول والی عورت دانت کچکچا کر رہ گئی۔

گوری چٹی عورت نے بڑھیا کا بازو پکڑ کر اسے سیٹ کی طرف کھینچا۔اور بڑھیا بیٹھ گئی۔

"عجیب وحشی عورت ہے۔" کسی کی آواز آئی۔

"یہ کون بولا؟" بڑھیا نے پلٹ کر بس کے آخری سرے تک نظریں دوڑائیں۔

"ذرا ایک بار پھر بولے کہ میں اس کی زباں یوں لمبی لمبی کھینچ کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔"

گوری چٹی عورت کو جھرجھری سی آ گئی اور وہ یوں سمٹ گئی جیسے بڑھیا نے سچ مچ لٹکتی ہوئی اور خون ٹپکاتی ہوئی زبان اس کے اوپر

سے گزار کر کھڑکی سے باہر اچھال دی ہے۔

''دیکھ مائی۔'' کنڈکٹر جو اس دوران میں دوسرے مسافروں کے ٹکٹ کاٹنے لگا تھا اس کے قریب آ کر سختی سے بولا۔''ساڑھے پانچ آنے دی گی یا نہیں؟''

''تو تو تھانیداروں کی طرح بولنے لگا لڑکے۔'' کہہ جو رہی ہوں کہ چونی یہ رہی۔ باقی رہے چھ پیسے تو وہ میں تجھے پہنچا دوں گی۔ کل والٹن میں آ کر بیٹھ جاؤں گی۔ اور تو آئے گا تو تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ کھرے کر لینا۔''

''لو اور سنو۔'' کنڈکٹر نے سب مسافروں سے فریاد کی۔

پھر یکا یک اس کے تنے ہوئے تیور ڈھیلے پڑنے لگے اور وہ ایک سفید پوش بزرگ کے پاس جا کر جھک گیا۔

بڑھیا نے انگلی سے گوری چٹی عورت کا گھٹنا بجایا اور جب عورت نے اس کی طرف دیکھا تو بڑھیا بولی۔''دیکھ رہی ہو؟''

عورت نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔''لگتے تو مائی ساڑھے پانچ ہی آنے ہیں۔ پھر یہ بس سرکاری ہے۔ یہ لڑکا سرکار کا نوکر ہے۔ ایک آنہ بھی کسی سے کم لے تو اپنی جیب سے ڈالے گا یا نوکری چھوٹ جائے گی غریب کی۔''

''ہے ہے بے چارا۔'' بڑھیا نے پیار سے کنڈکٹر کی طرف دیکھا۔''میں نے تو عمر بھر اپنا رزق اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ میں کیوں کسی کے رزق پر ڈاکہ ڈالوں چھ پیسوں کے پیچھے مجھے کیا خبر تھی وہ غوثا ہی دھوکا دے گیا۔ پر اسے کیا پتہ، وہ بے چارہ بھی تو ریڑھے پر لاہور آتا ہے۔ اب کیا کروں؟''

''یوں کرو۔'' گوری چٹی عورت نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔''میں تمہیں۔۔۔۔''

اتنے میں کنڈکٹر آ گیا۔ بڑھیا بولی۔''بھئی لڑکے مجھے تو خبر نہیں تھی کہ اس طرح۔۔۔''

کنڈکٹر بولا۔''بس مائی۔ اب حساب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تجھے والٹن پر ہی اتاروں گا۔''

بڑھیا کھل گئی۔''میں نے کہا تھا نا کہ تجھے تیری ماں نے بسم اللہ پڑھ کے جنا ہے۔ پر یہ بتا لڑکے۔ چونی ہی پر راضی ہو جاتا تھا تو ساڑھے پانچ آنے کا جھگڑا کیوں چلایا؟''

''حساب تو مائی ساڑھے پانچ ہی آنے سے پورا ہوا ہے۔'' کنڈکٹر بولا۔

''تو میں چھ پیسے کہاں سے لاؤں؟'' بڑھیا پھر اداس ہو گئی۔

''چھ پیسے مجھے مل گئے۔'' وہ بولا۔

''کہاں سے ملے؟'' بڑھیا نے پوچھا۔

''اس چودھری نے دیئے ہیں۔'' کنڈکٹر نے سفید پوش بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں دیئے ہیں؟'' بڑھیا نے حیران ہو کر پوچھا۔

کنڈکٹر بولا۔''ترس کھا کر دے دیئے۔''

بڑھیا اٹھنے کی کوشش میں سیٹ پر گر پڑی۔ ''کس پر ترس کھایا؟'' وہ چلائی۔

''تم پر اور کس پر۔'' کنڈکٹر بولا۔

بڑھیا بھڑک اٹھی اور چیخ کر بولی۔ ''ذرا میں بھی تو دیکھوں اپنے ترس کھانے والے کو۔۔۔۔۔''

گوری چٹی عورت نے فوراً پرس بند کر کے بڑھیا کی طرف دیکھنے لگی۔

بڑھیا چھت کی راڈ اور سیٹوں کی پشتوں کے سہارے سفید پوش بزرگ کی طرف جانے لگی۔ ''یہ چھ پیسے کیا تیری جیب میں بہت کود رہے تھے کہ تو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیئے جیسے کتے کی طرف ہڈی پھینکی جاتی ہے۔''

''لیجئے یہ ہے بھلائی کا زمانہ۔'' کوئی بولا۔

سفید پوش بزرگ کا رنگ مٹی کا سا ہو گیا اور بڑھیا بولتی رہی۔ ''ارے سخی داتا کہیں کے تو مجھ پر ترس کھاتا ہے۔ جس نے ساٹھ ستر سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اگنے اور خوشوں کے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیئے ہیں۔ تو ان ہاتھوں پر چھ پیسے رکھ رہا ہے۔ جنہوں نے اتنی مٹی کھودی ہے کہ اکٹھی ہو تو پہاڑ بن جائے اور تو مجھ پر ترس کھاتا ہے؟ کیا تیر گھر میں تیری کوئی ماں بہن نہیں ہے ترس کھانے کیلئے؟ کوئی اندھا فقیر نہیں ملا تجھے رستے میں؟ شرم نہیں آئی تجھے ایک کسان عورت پر ترس کھاتے ہوئے۔''

پھر وہ کنڈکٹر کی طرف پلٹی۔ ''یہ چھ پیسے جو اس نے مجھ پر تھوکے ہیں۔ اسے واپس دے دے اور مجھے یہیں اتار دے۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔ مجھے پیدل چلنا آتا ہے۔''

بڑھیا خاموش ہو گئی۔ بس میں صرف بس چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

بس ایک لمحہ بعد سٹینڈ پر رکی تو بڑھیا سیڑھیوں کی پروا کئے بغیر دروازے میں سے نکلی اور باہر سڑک پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر وہ اٹھی ، کپڑے جھاڑے اور ناقابل یقین تیزی سے والٹن کی طرف جانے لگی۔

بس میں سے کسی کی آواز آئی۔ ''عجیب وحشی عورت ہے!''

بیٹے بیٹیاں

ہادی کمہار نے سوچا کہ کل تک تو نازو بالکل ٹھیک تھی۔ آخر آج اچانک اس کی آنکھوں میں چور بتیاں کیوں جلنے لگیں؟ نازو سے کٹورا لے کر اس نے پانی تو پی لیا مگر پانی پیتے ہوئے وہ بھی کٹورے کے افق پر سے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

نازو کٹورا لے کر چلی گئی اور ہادی پاؤں لٹکا کر چاک گھمانے لگا۔ چاک پر گھومتی ہوئی ہنڈیا اس کی انگلی ک ہر مس سے نئی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ ہنڈیا اپنی تکمیل کی طرف جا رہی تھی۔

صبح اٹھتے ہی جب ہادی کی نظر نازو پر پڑی تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ کل کے مقابلے میں آج کچھ زیادہ بدلی ہوئی ہے۔ اور اس کے گالوں میں کچھ ایسی چمک سی ہے کہ اتنی چمک کے چولہے میں تو ہنڈیا میں پانی ابلنے لگے۔

اسے وارث یاد آ گیا جو اپنی آٹھ بیٹیوں کی دھوپ میں تپ کر کندن ہو چکا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ ''لوگو! بیٹیوں کی آنکھوں میں چور بتیاں جلتی دیکھو تو انہیں فوراً کہیں چلتا کر دو۔ چاہے انہیں گٹھڑی میں باندھ کر کسی کے دروازے پر ڈال آؤ۔ چور بتی جلتی رہے تو مسالہ ختم ہو جاتا ہے اور دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ دنیا بھر کے ماں باپ کے لئے ہر بیٹی کی عمر چودہ نہیں تو زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہونے چاہیے۔

اس کے بعد بیٹی مر جاتی ہے اور عورت پیدا ہو جاتی ہے۔''

ہادی کو اتنا یاد تھا کہ جن دنوں لام لگنے کی باتیں ہو رہی تھیں تو اس کے ہاں مراد پیدا ہوا تھا اور بیوی بیٹا دے کر خدا کے ہاں سدھار گئی تھی۔ پھر جب لام لگی ہے تو مراد ''ابا، اماں'' بول لیتا تھا اور صحن میں بھاگتا پھرتا تھا۔ اس وقت نازو پانچ چھ سال کی تھی۔ میاں جی کے ہاں پہلا سیپارہ پڑھنے جاتی تھی اور اب مراد بارہ سال کا ہے اس حساب سے نازو کی عمر ہوئی یہی کوئی۔۔۔۔۔۔

ہادی کمہار چارپائی پر سے گھبراہٹ میں اترا۔ نازو اس وقت پڑوس سے مانگی ہوئی لسی میں نمک کی ڈلی گھما رہی تھی۔ اس نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیا ہے بابا؟''

''کب سے اٹھی ہوئی ہو تم؟'' ہادی نے پوچھا۔

''دیر سے۔'' وہ حیران ہو کر بولی۔ ''مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔''

''تو مجھے کیوں نہیں اٹھا دیا؟'' وہ بولا۔ ''مجھ بدنصیب نے تو جب بھی فجر کی نماز پڑھی ہے، قضا ہی پڑھی ہے اور تم؟۔۔۔ تم نے نماز پڑھی ہے؟''

''نہیں بابا۔'' نازو نے جھینپ کر کہا۔

''منہ اندھیرے لسی لانا یاد رہ گیا، نماز پڑھنا بھول گئیں؟'' ہادی نے اسے خلاف معمول جھڑک دیا۔ اور پگڑی کے پلو سے آنکھیں ملتا ہوا باہر چلا گیا۔

ہادی کا معمول سا ہو گیا کہ صبح کو آنکھ کھلتے ہی چادر کو ایک جھٹکے کے ساتھ پرے پھینک دیتا اور سوتی جاگتی ہوئی نازو کی طرف آنکھیں

پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہر نئی صبح کے مس سے نازو نئی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ایک صبح کو تو وہ نازو کو ایک لمحے کے لئے پہچان ہی نہ سکا۔

اسوج کے دن تھے۔ راتیں بھیگ کر خنک ہو جاتی تھیں۔ آدھی رات کے بعد ہادی چادر اوڑھ لیتا اور جب صبح کو اٹھتا تو اس کے گھٹنے سینے سے لگ چکے ہوتے۔ ایک روز باپ بیٹی کوٹھے کے اندر سوئے مگر آدھی رات کو نازو اٹھی، چادر بغل میں ماری، چارپائی کو گھسیٹ کر آنگن میں لے آئی اور جب کواڑ بجنے سے ہادی کی آنکھ کھلی اور اس نے نازو کو پکارا تو وہ بولی۔ ''میں یہاں ہوں بابا اندر کے پسینے سے باہر کی ٹھٹھر ٹھٹھر بھلی۔''

ہادی خاموش ہو گیا، مگر کچھ دیر کے بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ پسینہ پسینہ ہوا جا رہا ہے۔ بستر بغل میں مار کر وہ بھی آنگن میں آ گیا۔ رات بھر کی خنکی کے مارے گٹھڑی بنا پڑا رہا اور صبح کو اٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ چارپائی پر کوئی سویا ضرور رہا ہے مگر وہ نازو نہیں ہے۔ وہ تو کوئی عورت ہے۔

نازو چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا کالا تہمد گھٹنوں تک چڑھ آیا تھا اور چھینٹ کا کرتا اس کے جسم پر کچھ یوں کس گیا تھا جیسے اس نے ایک بھی گہری سانس لی تو جگہ جگہ سے مسک جائے گا۔ نازو کی چوٹی اس کی گردن کے اردگرد سانپ کی طرح لپٹ گئی تھی اور جو چادر اس نے اوپر اوڑھنے کے بجائے نیچے بچھالی تھی۔ وہ زمین پر ڈھیر پڑی تھی۔

اچانک نازو نے ایک عجیب سی کروٹ لی، کروٹ لیتے ہوئے اس نے جسم کو چارپائی کے موٹے بان کے ساتھ اتنی سختی سے رگڑا کہ بان چھر رچھر ربول اٹھا۔ وہ دائیں طرف پلٹی۔ پھر الٹی ہو کر بائیں کروٹ پر آ گئی مگر رکی نہیں۔ بلکہ پھر سے چت لیٹ گئی اور ہادی کو ایسا لگا۔ جیسے نازو کے کرتے کا تنہا بٹن پٹاخے کی طرح ٹوٹ کر اسے ننگا کر دے گا۔ وہ نازو پر جیسے جھپٹا۔ اسے جھنجھوڑنے کے لئے جھکا۔ مگر بڑھے ہوئے ہاتھ کو یوں کھینچ لیا۔ جیسے وہ بے جانے بوجھے کسی غیر عورت کو چھونے چلا تھا۔ پھر وہ قریب قریب چلا اٹھا۔ ''نازو''

نازو یوں ہڑبڑا کر اٹھی کہ اس کے کرتے کا بٹن سچ مچ ٹوٹ گیا۔ پھر وہ کوٹھے کے اندر لپک گئی اور ہادی باہر گلی میں آ گیا۔۔۔ وہاں بھی رکا نہیں۔۔۔ بلکہ سیدھا نکلا چلا گیا اور اس روز اس نے سب کمہاروں کے گھروں کے چکر لگا ڈالے۔ وہ ہر گھر میں جوان کمہاروں کو دھواں چھوڑتے ہوئے آووں پر اپلے بچھاتے یا چاکوں پر اتنی تیزی سے برتن بناتے دیکھتا رہا۔ جیسے برتن چاک میں سے اگتے چلے آ رہے ہوں۔ ہادی بے ضرر سا کمہار تھا۔ نہ کسی کے لینے میں تھا نہ دینے میں۔ مہینوں اپنے گھر ہی سے نہیں نکلتا تھا۔ اور کبھی نکلا بھی تو آوے سے اترے ہوئے برتن بیچنے کا کسی کے آوے کا کوئی کونا کھدرا مانگنے تا کہ دوسروں کے گھڑوں اور ہانڈیوں کے ساتھ اس کے برتن بھی پک جائیں۔

آوے کا ایک حصہ تو وہ مانگ سکتا تھا۔ مگر اپنی بیٹی کے لئے بر کیسے مانگتا۔ بس ناٹے سجیلے نوجوان کمہاروں کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے بچے مٹھائی کی طرف دیکھتے ہیں۔

نازو سے اسے حجاب سا آنے لگا تھا۔ وہ جب اس کے سامنے کھانا لا کر رکھتی یا اس کے ہاتھ میں لسی کا کٹورا تھماتی تو ہادی کا جی چاہتا

کہ وہ یہ دیکھنے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکے کہ وہاں پر چور بتیاں ابھی تک جل رہی ہیں یا مسالہ ختم ہو چلا ہے۔ مگر اس وقت اس کے ذہن میں ناز و چارپائی کے موٹے بان پر اپنے جسم کو چھیلتی ہوئی دوہری کروٹ لیتی اور اسے ناز و سے وحشت ہونے لگتی۔ البتہ جب وہ خالی برتن لے کر واپس جاتی تو ہادی اس کی طرف دیکھتا۔ چند ہی دنوں میں اس کا قد کتنا لمبا ہو گیا تھا۔ اور اس کے بازوؤں کے خطوط کیسے دمکنے سے لگے تھے اور وہ بالوں کا تنا بڑا ڈھیر گھر کے کس گوشے میں چھپ کر اگاتی رہی تھی۔

اپنے گاؤں سے مایوس ہو کر وہ ایک دن قریب کے ایک اور گاؤں میں قسمت آزمائی کرنے جا نکلا۔ چھوٹے سے اس گاؤں میں صرف ایک کمہار رہتا تھا جو کسی پشت سے اس کا رشتہ دار بھی تھا۔ اس کی دو جوان اولادیں تھیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ عرصہ ہوا اس کی بیوی مٹی کھودتے ہوئے مٹی ہی کے ایک تودے کے نیچے دب کر مر گئی تھی۔ بیٹے بیٹی کو زندہ رکھنے کے لئے اس نے دن رات چاک چلایا تھا اور چاک چلاتے ہوئے اس نے اتنی بار پاؤں کو حرکت دی تھی کہ بقول اس کے اگر کوئی چلتے ہوئے اتنی بار پاؤں ہلائے تو کابل قندھار پہنچ جائے۔

ہادی جب اس کے ہاں پہنچا تو پورا کنبہ بیری کے سائے میں ایک رنگین گھڑے کے اردگرد جمع تھا۔ بیگو بیٹے بیٹی کو مشورہ دے رہا تھا اور وہ سرخ رنگ پر سبز اور سنہری بیل بوٹے بنا رہے تھے۔ وہ ان سے کہہ رہا تھا۔

''گلاب کے پھول اور گوبھی کے پھول میں بہت فرق ہوتا ہے دینو اور دیکھ ری شرفی تو نے یہ چڑیا بنائی ہے کہ مولی؟''

دینو اور شرفی ہنس رہے تھے اور بیگو ایک باچھ میں حقے کی نال رکھے دوسری باچھ سے مسکرا رہا تھا۔ ہادی کو یہ ماحول بڑا پیارا سا لگا۔ پچھلے چند دنوں سے اس نے اپنے دل کو اپنی مٹھی میں بند کر رکھا تھا۔ مگر بیگو کے آنگن میں قدم رکھتے ہی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کا دل کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا کر، جیسے بیری کی ایک شاخ پر جا بیٹھا۔ بیگو نے دیکھا تو یوں ایک دم اٹھا کہ حقے کے ٹوپی اپلے کی راکھ بکھیرتی ایک دائرے میں دور تک لڑھکتی چلی گئی اور پھر حقے کے پاس واپس آ گئی۔ دینو اور شرفی رنگوں کی پیالیوں میں سرکنڈوں کے سرے ڈبو کر رہ گئے۔ ہادی کے قریب جا کر بیگو بولا۔

''نہیں تم ہادی نہیں ہو سکتے۔ تم ہادی ہوتے تو یہاں برسوں کے بعد نہ آتے۔ کل آتے جب دو گدھوں پر لدے ہوئے تمہارے کورے برتنوں کے دو بورے میری گلی میں سے بولتے ہوئے گزر گئے اور تم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ یہ بیگو کا گھر ہے۔ یا اس کی قبر ہے اور اگر تم ہادی ہو تو بڑے ہی بے حیا آدمی ہو۔''

جب بیگو نے بات ختم کی تو اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھی۔ ہادی اس سے بچوں کی طرح لپٹ گیا تو اس نے ہادی کی پیٹھ پر زور کا ایک دھموکا مار کر اسے سینے سے لگا لیا۔ اور پھر الگ ہو کر بولا۔

''تم ان لوگوں کو نہیں جانتے ہو گے۔ یہ میرا بیٹا ہے دینو اور یہ میری بیٹی ہے شرفی۔۔۔۔۔ اور بچو۔ یہ بھی تمہارا کوئی ہوتا سوتا ہے۔''

دینو نے بیری کے نیچے فوراً ایک کھاٹ بچھا دی، شرفی اس پر کھیس بچھایا اور اس کے بعد دینو حقہ تازہ کرنے میں لگ گیا۔ اور شرفی

چولہے کے پاس جا بیٹھی اور بیگو ہادی کے بازوؤں کو ٹٹولنے لگا۔

''سچ مچ بتاؤ تم ہادی ہو کہ کوئی بھوت ہو۔'' وہ بولا۔ ''مجھے تمہارا کتنا انتظار تھا ہادی۔''

اور ہادی سوچنے لگا کہ آخر بیگو کو اس کا کاہے کو انتظار تھا۔ انتظار تو بیٹی کے باپ کو ہوتا ہے۔ بیٹے کا باپ تو انتظار نہیں کرتا بیٹے کے باپ کو تو انتظار کیا جاتا ہے تو وہ انتظار کراتا ہے۔

''تمہیں کاہے کو انتظار تھا میرا؟'' ہادی نے ہمت کر کے بیگو سے پوچھ ہی لیا۔

اور بیگو، دور کونے میں بیٹھی ہوئی شرفی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولا۔ ''میں ایک بیٹی کا باپ ہوں ہادی۔''

ہادی کا دل بیری کی شاخ پر سے جیسے پھڑ پھڑا کر گرا اور اسکی بھینچی ہوئی مٹی میں گھس گیا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔ ''ٹھیک ہے بیگو کی بیٹی بھی تو ہے۔''

دینو نے حقہ لا کر ہادی کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔ ''بابا میں ذرا قصائیوں کے ہاں جاتا ہوں، شائد گوشت ہوا ہو۔''

ہاں ہاں! بیگو بولا۔ ''ضرور جاؤ۔ گوشت نہ ملے تو دلی کے ہاں سے ایک چوزہ پکڑتے لانا۔ کہنا اگلا آوہ اترے ہی اکھٹے دس گھڑے پہنچا دوں گا۔ ہادی روز روز تو نہیں آئے گا یہاں۔''

دینو چلا گیا۔ شرفی جو چولہے میں پھونکیں مار مار کر آنکھوں اور چہرے کو لال کر چکی تھی اٹھی۔ دوپٹے کو بڑے قرینے سے لپیٹا اور گھڑا اٹھائے بیری کی طرف آنے لگی۔ جس پر بہن بھائی نقش و نگار ابھارتے رہے تھے۔

''کہیں حفاظت سے رکھنا بیٹی۔'' بیگو نے کہا۔ ''اوپر کوئی کپڑا ڈال دینا۔ مکھیاں بیٹھ گئیں تو ناس مار دیں گیں'' پھر وہ ہادی سے مخاطب ہوا۔ صوبیدار کے بیٹے کی شادی ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ صوبیدار نے کہا ہے ایسی ''گھڑولی'' بناؤ کہ علاقے میں نام نکل جائے۔ دلہن کی سہیلیاں ویسے تو پنگھٹ پر ، گھڑولی بھرنے جاتی ہیں نا۔ صوبیدار کہہ رہا تھا کہ وہ اس گھڑولی کو عرق گلاب سے بھروا دے گا۔ بہت کھاتا پیتا ہے۔ گاؤں کا سردار ہے۔ سو روپے پنشن ملتی ہے۔''

''تمہیں کیا ملے گا؟'' ہادی نے پوچھا۔

''دوسرے ایک دیتے ہیں۔'' بیگو بولا۔ ''یہ پانچ دے گا۔ شاید زیادہ بھی دے دے۔ حوصلے والا آدمی ہے۔ مجھے تو۔۔۔۔'' بیگو رک گیا اور جب شرفی گھڑا اٹھا کر کوٹھے میں چلی گئی۔ تو آہستہ سے بولا۔ ''مجھے تو آج کل ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ آخر ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں۔''

''ایک جوان بیٹے کے باپ بھی تو ہو۔'' ہادی نے کہا اور فوراً پچھتانے لگا کہ اس نے ایسا کیوں کہہ دیا۔ دونوں باتوں میں آخر رشتہ ہی کون سا تھا۔ اس نے گھبرا کر بیگو کی طرف دیکھا مگر بیگو تو مسکرا رہا تھا، وہ بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ بس اسی سہارے تو زندہ ہوں کہ ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں تو میرا ایک جوان بیٹا بھی تو ہے۔ کوئی بیٹی کا پوچھنے آئے تو بیٹے کا رشتہ دے کے جائے۔ کسی نے بیٹے کی بات کی بیٹی کے رشتے کی شرط لگا دوں گا۔ ایک لے جاؤ ایک دے جاؤ معاملہ

برابر۔ پر کوئی پوچھتا بھی تو نہیں۔ دینو اٹھارہ سال کا ہے۔ شرفی ایک سال چھوٹی ہے۔ ان کے ہم عمروں کے ہاں، دو دو تین تین بچے ہیں اور یہاں جوانیاں گلی جا رہی ہیں۔"

ہادی کو بیگو نے جیسے کندھوں سے پکڑ کر چاک کی طرح گھما دیا۔ انہی چکروں میں وہ بیگو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے حیائی سے بولا۔ "اور اگر میں کہوں کہ میں اپنی نازو کو تمہارے دینو کے حوالے کرتا ہوں؟"

"تو میں کہوں گا" بیگو نے بھی اسی بے حیائی، بلکہ مسکرا کر کہا۔ "تو میں کہوں گا کہ میں اپنی شرفی کو تمہارے مراد کے حوالے کرتا ہوں۔"

"مراد؟" ہادی یوں چلایا، جیسے دونوں ویرانے میں بیٹھے ہیں۔ اور ان کے آس پاس میلوں تک کوئی آدم زاد موجود نہیں ہے۔ پھر اس نے چونک کر چولہے کے ساتھ سلی ہوئی شرفی کی طرف دیکھا اور بہت مدھم سرگوشی میں بولا۔

"مراد؟" ارے وہ تو ابھی ذرا سا لڑکا ہے۔ کل گیارہ سال تو اس کی عمر ہے۔"

"ہنڈیا ونڈیا تو بنا لیتا ہوگا؟" بیگو نے جیسے ہادی کی اطلاع سنی ہی نہیں تھی۔

اور ہادی بولا۔ "ارے اس نے مٹی کو چھوا تک نہیں۔ وہ تو مسجد میں پہلا سیپارہ پڑھ رہا تھا۔ جب ملک علی کا بیٹا اسے لاہور لے گیا وہاں وہ لاٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہے اور مراد اس کا نوکر ہے۔ سنا ہے اب تو پلاؤ تک بنا لیتا ہے۔"

"اچھا تو وہ لاہور میں ہے؟"

ہاں پانچ سات سال کا تھا جب تم نے دیکھا تھا۔ اب گیارہ بارہ کا ہوگا۔"

بیگو نے ہنس کر کہا۔ "سدا گیارہ بارہ کا تو نہیں رہے گا۔ پانچ چھ سال میں دینو سے بھی قد نکال لے جائے گا۔ تمہارے باپ دادا تو چھ فٹے جوان تھے۔ تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔ میرا سر تمہاری ٹھوڑی کو چھوتا ہے۔ بچوں کا کیا ہے۔ کدو کی بیل کی طرح بڑھتے ہیں۔ صبح یہاں ہیں شام کو وہاں پہنچ رہے ہیں۔"

ہادی کو یہ بات مطمئن نہ کر سکی، آگے کھسک کر بیگو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "شادی کی ایک عمر ہوتی ہے نا۔ مراد کی شادی کی عمر کہاں؟"

"یوں بھی ہوتا ہے۔" بیگو بولا۔ "کہ شادی کی عمر آئی اور گزر گئی اور نصیبہ ہی نہ جاگا۔"

ہادی نے ایک بار فیصلہ کر لیا کہ وہ بیگو سے سچی بات کہہ دے مگر پھر محسوس کیا کہ بات کہتے ہوئے اس کی زبان چر جائے گی۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ میرے لئے تو اپنی پندرہ سال کی نازو ہی مصیبت بن گئی ہے۔ میں تمہاری سترہ برس کی شرفی پر مراد کے جوان ہونے تک کہاں پہرے دیتا پھروں گا۔ اور جوانیاں جب آتی ہیں تو یونہی چپکے سے نہیں کھسک جاتیں۔ وہ تو پیروں کی طرح نذرانے مانگتی ہیں اور ہم غریبوں کی بیٹیاں اگر نذرانے بانٹتی پھریں تو عمر بھر کوئی تھوکے بھی نہیں۔

"بھئی سچی بات ہے۔" آخر ہادی کو صرف یہ کہنے کی توفیق ہوئی۔ "مراد بہت چھوٹا ہے۔" پھر وہ اس ڈر کے مارے کہ کہیں بیگو

پہلے سے نہ بول دے۔فوراً کہنے لگا۔"دینو کے لئے میری ناز وموجود ہے۔شرفی کیلئے بر ڈھونڈنا میرا ذمہ رہا۔"

بیگو حقے کو ایک طرف ہٹا کر، بڑی سنجیدگی سے اور نہایت چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر ایسی بات ہے تو تم میری شرفی کے لئے بر کیوں ڈھونڈتے پھرو۔اپنی ناز و کے لئے کیوں نہ ڈھونڈو"۔۔۔پاؤں لٹکا کر اس نے جوتا پہنا اور بولا۔"صرف اپنی بیٹی کا باپ بن کر مت سوچو۔بیٹیاں دوسروں کی بھی ہوتی ہیں۔اور وہ انہیں بھی بڑی پیاری ہوتی ہیں۔"اور وہ حقے پر سے ٹوپی اتار کر چولہے کی طرف اس تیزی سے بڑھا جیسے فوراً نہ پہنچا تو آگ بجھ جائے گی۔

ہادی یوں سکڑ کر رہ گیا جیسے بیگو نے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اس کے سارے کپڑے اتار کر پھینک دیئے ہیں۔اس کا جی چاہا کہ باپ بیٹی کی آنکھ بچا کر کھسک جائے اور گاؤں کی گلیوں میں سرپٹ بھاگتا ہوا اتنی دور نکل جائے جہاں اسے مرتے دم تک بیگو کا سامنا نہ کرنا پڑے۔بیگو کے سامنے وہ کتنا چھوٹا سا ہو کر رہ گیا تھا۔بالکل چوہا سا۔

"کش لگاؤ گے؟"بیگو نے جیسے اس کے سر پر گولا چھوڑ دیا۔پھر وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"گھبرا کیوں گئے ہو ہادی۔میں جانتا ہوں،تم کیا سوچ رہے ہو،میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم آج برسوں کے بعد میرے پاس کیوں آ نکلے ہو اور یہ بھی بتا دوں کہ تم نہ آتے تو خود میں چند دنوں میں تمہارے پاس آ نکلتا۔"

ہادی کی ڈھارس بندھی۔بیگو کی طرف دیکھے بغیر چند کش لگائے اور نال گھوما کر بیگو کو تھمانا چاہتا تھا جب بیگو نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور بڑی نرمی سے بولا۔

"سنو!یوں کیوں نہ کر لیں۔"

بیگو بولا۔"دینو تمہارا داماد بن جائے اور تم میرے۔"

"میں!"ہادی ایک بار پھر چیخ اٹھا اس نے تڑپ کر شرفی کی طرف دیکھا جو کڑاہی میں چمچہ چلا رہی تھی۔پھر آگے کھسک کر وہ بیگو کے گھٹنے پر گھٹنا رکھتے ہوئے بولا۔میں کیسے؟"

بیگو نے اس کے بازو کو تھپتھپا کر کہا۔"کنپٹیوں پر،بالوں کی ذرا سی سفیدی سے،لوگ بوڑھے نہیں ہو جاتے اور تم تو ابھی چالیس برس کے بھی نہیں ہو گے مجھے تو تمہاری پیدائش تک یاد ہے۔میں تو ان دنوں اچھا خاصا سیانا تھا۔میانوالی کے بازار میں جا کر گھڑے اور صحنکیں بیچ آتا تھا۔"

"پر میں کیسے بھئی بیگو۔"ہادی نے فریاد کی۔"دنیا کیا کہے گی۔دنیا تو یہی کہے گی کہ اپنی شادی کی خاطر بیٹی کا سودا کر لیا۔"

بیگو بولا۔"اور دنیا اس وقت کیا کہے گی جب تمہاری بیٹی کنواری بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جائے گی اور پھر دنیا کا کیا ہے۔دنیا کی زبان تو کئی نیک پاک پردہ داروں کی بھی معاف نہیں کیا۔تمہاری میری بیٹیاں تو کمہارنیں ہیں۔مٹی ڈھونے،اور برتن بیچنے اور چھتیں لیپنے والیاں۔ان پر تو لوگ جب چاہیں بدنامیوں کے ٹوکرے الٹ دیں۔"

ہادی نے رکتے رکتے کہا۔"سچ کہتے ہو،پر میں تو۔۔۔"

اوپر سے دینو چیختا چلاتا ہوا ایک چوزہ پکڑے آ گیا اور بات وہیں ختم ہوگئی۔ پھر جب دن ڈھلے ہادی نے واپس گاؤں جانا چاہا تو دینو نے شرفی کو پکارا۔

ادھر آ شرفو۔ چاچا جا رہا ہے۔"

شرفی ذرا سی لڑکی کی طرح بھاگتی ہوئی آئی اور ہادی کے سامنے مسکراتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ مگر ہادی کے تیور دیکھ کر جیسے دینو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہادی نے گھبراہٹ میں دینو سے بھی ہاتھ نہ ملایا اور دونوں بھائی بہن چپ چاپ وہیں بیری کے نیچے کھڑے رہ گئے۔

گلی کے سرے پر پہنچ کر بیگو نے ہادی کو بھینچ کر سینے سے لگایا۔ اور پھر ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ "تو پھر وہ بات ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" ہادی نے نہ جانے اس دوران میں کب فیصلہ کر لیا تھا۔ اور بیگو نے اسے ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔

نازو کی شادی کے بعد، ہادی گھر سے باہر ہوتا تو لوگوں سے چھپتا پھرتا اور گھر آتا تو شرفی سے کترا تا رہتا رات کو جب شرفی برتن دھو کر فارغ ہو جاتی اور کواڑ بند کر کے اور دیا بجھا کر اپنی چارپائی پر پڑی رہتی تو ہادی کتنی دیر تک اندھیرے میں گھومتا رہتا آنکھیں بند کرتے ہوئے اسے ڈر لگتا۔ کیوں کہ اس طرح اندھیرا چمکنے لگتا تھا اور چاروں طرف سے انار سے چھوٹنے لگتے تھے۔ وہ کئی بار آہستہ سے کواڑ کھول کر صحن میں نکل جاتا اور ماگھ اور پوہ کی ٹھنڈی راتوں میں دیر تک ادھر سے ادھر گھومتا رہتا۔ اس دوران میں وہ شرفی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ کبھی وہ اسے رنگین "گھڑولی" پر چڑیوں کی تصویریں بناتی نظر آتی اور کبھی چولہے میں پھونکیں مارتے مارتے تھک کر اٹھتی اور تپا ہوا چہرہ اور دبکی ہوئی آنکھیں لئے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگتی اور ہادی کا جی چاہتا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی چادر کے پلو سے اس کی بھیگی ہوئی سرخ آنکھیں پونچھ ڈالے اور اس کے چہرے کو کتاب کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس سے کہے۔

"شرفی، اب کیا ہوگا۔"

اور ایک روز یخ بستہ اندھیرے میں ٹہلتے ٹہلتے اچانک کوٹھے کی طرف بڑھا آہستہ سے کواڑ کھول کر اندر گیا۔ کواڑ بند کر کے دیا سلائی اٹھائی اور دیا جلایا۔ پھر وہ پنجوں کے بل شرفی کے پاس آیا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے سو رہی تھی اور اس کی بالوں کے لٹ نیچے فرش تک پہنچ رہی تھی۔ ہادی نے لٹ کو اس پھول کی طرح چھوا، جو ذرا سے مس سے پتی پتی ہو کر بکھر جاتا ہے۔ مگر شرفی کو جیسے اس مس نے بھی جھنجھوڑ ڈالا وہ تڑپ کر اٹھی اور ہادی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ پھر اس نے تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے حواس باختہ ہادی کو کھینچ کر چارپائی پر بٹھا لیا۔ اور اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بچے کی طرح سسکنے لگی پھر اس نے ہادی کو نا قابل یقین قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچ کر اپنے گال اس کی دو روز کی بڑھی ہوئی داڑھی سے رگڑ ڈالے اور اس کے کندھوں پر سر رکھ کر کچھ اس طرح مچل کر رونے لگی۔ جیسے ہادی نے اسے بروقت نہ روکا تو وہ آنسو بن کر بہہ جائے گی۔

کڑوے تیل کے دیئے کی زرد میلی روشنی میں بت کی طرح بیٹھے ہوئے ہادی کو اس عجیب و غریب لمحے میں سوائے اس کے کوئی بات نہ سوجھی کہ وہ بھی رونے لگے مگر وہ رویا نہیں۔ شرفی کو نرمی سے الگ کر کے اٹھا۔ دیئے کے پاس جا کر تیلی سے اس کی لو بلند کر دی اور

پھر اسے اٹھا کر شرفی کے پاس لے آیا۔ دیئے کو شرفی کے پاس لے جا کر وہ پاگلوں کی طرح اسے گھورنے لگا۔ شرفی لمحے بھر کیلئے تو گھبرا کر رونا بھول گئی اور صرف دو ایک سسکیوں نے اس کے چہرے کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ پھر اس نے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر چمٹے ہوئے بالوں کو ہٹایا اور مسکرانے لگی۔ وہ اپنا چہرہ دیئے سے اتنا قریب لے آئی کہ اگر ہادی اسے فوراً نہ ہٹا لیتا تو اس کی پلکیں جل جاتیں۔ دیئے کو زمین پر رکھ کر ہادی اٹھا اور اپنی چادر کے پلو سے شرفی کی آنکھیں اور چہرہ پونچھنے لگا اور شرفی بچوں کی طرح ٹھوڑی اٹھائے بیٹھی رہی۔ پھر ہادی نے اس کے بالوں کو کانوں کے پیچھے اٹکا کر دیا اٹھایا اور طاقچے پر رکھ کر پھونک ماردی واپس آ کر اس نے شرفی کے سر کو اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ اور اس کے بالوں کے نیچے ہاتھ لے جا کر اس کی گردن کھجاتے ہوئے بولا۔ ''شرفی۔''

شرفی نے اس سے بھینچ کر کہا۔ ''اللہ کا شکر ہے۔ تم میرا نام تو جانتے ہو۔''

چھ سات سال کے عرصے میں ہادی نے اتنے گھڑے، صحنکیں، پیالے اور ہانڈیاں اور سرپوش بنا ڈالے کہ اس کے ہم عمر کمہاروں نے اپنی ساری عمر میں بھی شائد ہی بنائے ہوں۔

مٹی کو بھگوتی اور اسے آٹے کی طرح گوندھتی ہوئی شرفی، ہولے ہولے گیت گنگناتی اور مٹی کو چاک پر رکھ کر ہادی اس گیت کے تال کر برتن بناتا اور جب یہ برتن آوے سے پک کر آتے اور ہادی ایک کنکری یا انگشت شہادت کے جوڑ سے، سب برتنوں کو ایک ایک کر کے بجاتا تو وہ کانسی کے کٹوروں کی طرح گنگناتے اور ہادی کہتا۔

''شرفی اپنی آواز سن رہی ہو؟''

شرفی اس کی طرف بڑے پیار سے دیکھتی، پھر اگر ہادی کسی ٹوٹے ہوئے برتن کو بجا بیٹھتا تو شرفی تڑپ کر کہتی۔ ''ہادی۔ اپنی آواز سن رہے ہو؟'' دونوں زور زور سے ہنستے اور پڑوسی ان کی ہنسی کی آواز سن کر کہتے کہ شرفی کا سن شادی کے روز جہاں تھا وہیں رک گیا ہے اور ہادی پھر سے جوان ہو رہا ہے۔ شرفی کنوئیں سے پانی بھر کے لاتی تو عورتوں کی کہی باتیں ہادی کو سناتی اور ہادی کہتا، شرع میں کیا شرم ہے شرفی۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ میں جوان نہیں ہو رہا تو کیا بوڑھا ہو رہا ہوں؟ چھ سات سال ہو گئے۔ کبھی سر میں درد تک نہیں ہوا کہ بڑھاپے کی شکایت لے بیٹھوں۔ کھانسنا تک بھول گیا ہوں۔''

اس عرصے میں شرفی کے ایک بیٹا ہوا مگر دو دن بعد مر گیا اور شرفی رو دھو کر اپنے دوادارو میں مصروف ہو گئی پھر بیگو کو نمونیہ ہو گیا۔ شرفی نے میکے جا کر چند دن بین کئے، واپس آ کر اپنے کاموں میں لگ گئی۔ دینو، نازو کو لے کر مزدوری کرنے لائل پور کی طرف نکل گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سے خط لکھا کہ ہم نے یہیں چھونپڑی ڈال لی ہے۔ گاؤں میں آ کر کیا کریں۔ مٹی کے برتنوں کا رواج اٹھ رہا ہے۔ ہم خود چینی کے پیالوں میں چائے پیتے ہیں۔

دو تین بار مراد چھٹی پر آیا۔ ایسے ٹھاٹھ تھے جیسے بی۔ اے پاس کر آیا ہے اپنے علاقے کی زبان تک بھول گیا تھا۔ ''جاواں گے۔۔۔۔ لیاواں گے۔'' بولتا تھا۔ بالوں میں ایسے تیل ڈالتا تھا کہ جہاں سے گزرتا تھا، گزوں تک لوگ لمبی لمبی سانسیں لیتے رہ جاتے۔ جب وہ آخری بار آیا تو اس نے داڑھی مونچھیں صاف کر رکھی تھیں اور ایک چمکتی ہوئی پائپ میں بگلے کا سگریٹ رکھ کر پیتا تھا۔ اور

قدیوں ایک دم بڑھ گیا تھا جیسے کسی نے اسے سر اور پاؤں سے پکڑ کر کھینچ دیا ہے۔ وہ ہادی اور شرفی کے لئے قسم قسم کی چیزیں لے آیا بسکٹ اور رنگین کاغذ میں لپٹی ہوئی مٹھائیاں اور سنہری کنگھے اور طباق بھر کے آئینے۔ مگر جب واپس گیا تو اپنے پیچھے بہت تیز خوشبو چھوڑ گیا اور خوشبو یہ تھی ک کمہار ہو کر عشق کرتا ہے اور اس نے غضب یہ ڈھایا کہ ایک دھوبن کو لیڈی ہملٹن کا تہمد اور عطر کی دو شیشیاں دے گیا ہے اور دھوبن کی ماں نے یہ تینوں چیزیں پکڑ لی ہیں اور اپنے صندوق میں رکھ لی ہیں۔

یہ خبر جب ہادی تک پہنچی تو اس کی صورت کچھ ایسی نکل آئی جیسے اس کی زندگی کے چھ سات برس، بس ایک پل میں گزر گئے۔ اور وہ اچانک بوڑھا ہو گیا ہے۔ شرفی بھی دن بھر کھوئی کھوئی سی رہی۔ رات دیر تک میاں بیوی بیٹھے مشورہ کرتے رہے اور آخر فیصلہ کیا کہ مراد کیلئے جلدی کوئی رشتہ ڈھونڈا جائے اور لاہور سے بلا کر اس کا بیاہ کر دیا جائے۔

ابھی دونوں رشتے کا سراغ لگانے میں مصروف تھے جب ایک شام کو مراد بکس اور بستر سر پر رکھ کر گھر آ گیا۔ ہادی نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ ملک عالم علی کے بیٹے نے جواب دے دیا ہے۔ کہا ہے تم بہت بڑے ہو گئے ہو اور مجھے تو چھوٹی عمر کا نوکر چاہیے۔

تین چار دنوں کے بعد ملک عالم علی نے ہادی کو اپنے ہاں بلایا اور اسے اپنے بیٹے کا خط پڑھ کر سنایا۔ لکھا تھا کہ مراد نے یہاں میری برسوں کی عزت پر پانی پھیر دیا ہے۔ اس نے پڑوس کی ایک نوکرانی کے ہاتھ پر اپنی ساری تنخواہ رکھ دی اور رات کو اسے اپنی کوٹھڑی میں لے آیا۔ وہ تو اتفاق ہو گیا کہ مجھے اسی وقت کسی ضرورت سے اس کی کوٹھڑی میں جانا پڑا۔ نوکرانی کو میں نے دھکے مار کر نکال دیا اور مراد کو کرایہ دے کر اسی لمحے گاڑی میں بٹھا دیا۔ مگر پڑوس کے نوکروں کو سارا قصہ معلوم ہو گیا اور دوسرے دن بات میرے دفتر تک پہنچ گئی۔ آپ ہادی سے کہئے کہ اپنے بیٹے کو باندھ کر رکھے۔ مکھن توس کھاتے کھاتے اس کا ہاضمہ بگڑ گیا ہے۔

ہادی واپس گھر آ کر شرفی کو کوٹھے میں لے گیا اور اسے سارا قصہ سنایا۔ شرفی کچھ دیر تک ٹھوڑی کو مٹھی میں لئے سوچتی رہی پھر بولی۔

''جلدی سے اس کی شادی کا بندوبست کر دو ورنہ ہمیں بھی لائل پور، ملتان کی راہ لینی پڑے گی۔ تم بھی کوشش کرو میں بھی کرتی ہوں۔ تین سو روپیہ جو جمع کر رکھا ہے اسے چادر کے پلو میں باندھو اور لڑکی کی تلاش میں جہاں تک جا سکتے ہو جاؤ۔ مراد اگر لاٹ کے شہر میں ایسا کر سکتا ہے تو صوبیدار کے گاؤں میں تو وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے گا۔ بیٹا بیٹی، بہت پیاری چیزیں ہوتی ہیں مگر جوان ہو جائے تو یوں سمجھو کہ تمہارے صحن میں سونے کی ایک ڈلی پڑی رہ گئی ہے اور تم گھر سے کوسوں دور چلے گئے ہو۔ جس کی آنکھ پڑے گی۔ لپک لے گا۔''

ہادی ایک ثانیے کے لئے حیران ہوا کہ شرفی اتنی بہت سی دانائیاں کہاں سے جمع کرتی رہی ہے۔ مگر اس وقت گنگناتا ہوا مراد حقے کی ٹوپی ہاتھ میں لئے چولہے کی طرف جاتے ہوئے دروازے کے سامنے سے گزر گیا۔ اور ہادی سنبھل بیٹھا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''بہت ٹھیک کہتی ہو۔''

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ چادر اٹھا کر کندھے پر رکھی اور صحن میں آ گیا۔ مراد کو اپنے پاس بلایا۔ اور پرلی طرف دیوار کے سائے میں لے جا کر، اسے ملک عالم علی کے بیٹے کے خط کا مضمون سنا دیا۔

''بکتا ہے۔'' مراد بولا۔ ''خود جو کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ وہ میں بتا دوں تو عالم علی کو دنیا کی نظروں سے چھپنے کے لئے کنوئیں میں کود جانا پڑے اور خود عالم علی کہاں کا فرشتہ ہے۔ اس کے بیٹے نے مجھے اس کے سارے کرتوتوں کے قصے سنائے ہیں۔''

''تم کمہار ہو۔'' بیٹے کو ڈانٹنے کے لئے ہادی کو صرف یہی الفاظ سوجھ سکے۔

مراد فوراً بولا۔ ''کمہار کا بیٹا ہوں۔ اس لئے کمہار نہیں کہلاؤں گا تو کیا ملک کہلاؤں گا۔''

ہادی پر ایک دم پانی پڑ گیا جیسے سارا کیا دھرا اسی کا ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' تمہیں شہروں کی ہوا لگنے دی اور تمہیں اتنا بھی نہ بتا سکا کہ کمہاروں کی بھی عزت ہوتی ہے اور اس عزت کی حفاظت کمہار کرتے ہیں۔''

''تو ابا۔'' مراد اس کے بالکل قریب آ کر اور اسکے آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا۔ ''یہ بتاؤ جب تم اس بڑھاپے میں ایک جوان لڑکی سے شادی کرنے کے لئے اپنی جوان بیٹی کا سودا کر رہے تھے تو اس وقت کمہاروں کی عزت۔۔۔''

ہادی نے مراد کے منہ پر اس زور کا تھپڑ مار دیا کہ منڈیر پر سے چڑیاں اڑ گئیں اور دہلیز پر بیٹھی ہوئی شرفی۔ گیند کی طرح اچھل گئی۔ مراد ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر ہادی نے زار زار روتے ہوئے، چادر کا ایک پلو منہ میں ٹھونس لیا اور دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا، شرفی اس کی طرف بھاگی۔ مراد بھی پلٹا اور شرفی سے پہلے اپنے بازو سے ہادی کو لپیٹ لیا۔

''نہیں ابا۔'' وہ بولا، مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے پاؤں چھوتا ہوں۔ اس نے جھوٹا خط لکھا۔ اس لئے مجھے غصہ آ گیا۔''

شرفی ایک طرف کھڑی ہادی اور مراد کی طرف دیکھتی رہی اور جب ہادی نے آنسو پونچھ کر اس کی طرف پٹے ہوئے بچے کی طرح دیکھا تو یوں دیکھتا رہ گیا جیسے پوچھ رہا ہے۔ ''تو کیا تم نے ساری باتیں سن لی ہیں؟''۔۔۔ مگر شرفی سینے پر بازوؤں کی قینچی بنائے کھڑی رہی اور جب مراد وہاں سے اٹھ کر ایک طرف جانے لگا تو اس نے ہادی کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا، اس کے کپڑوں کی گرد جھاڑی اور آہستہ سے بولی۔

''جاؤ۔ جیسا میں نے کہا تھا ویسا کرو۔ میں بھی جاتی ہوں۔ کھانا اچار سے کھا لیں گے۔''

ہادی نے آس پاس کے دیہات کے کتنے چکر ڈالے، شرفی نے اپنے گاؤں میں کمہاروں کا ایک ایک گھر چھان مارا۔ مگر قریب قریب سب کمہار بیٹیوں کے ساتھ بیٹے لئے بیٹھے تھے۔ جو فوراً جوابی رشتہ طلب کرتے تھے اور ہادی اور شرفی مایوس ہو کر اٹھ آتے تھے۔ اگر کسی کے ہاں صرف لڑکی تھی تو وہ بارہ سو سے نیچے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اور یہاں کل اثاثہ ہی تین سو تھا۔

اس دوران میں یہ غضب بھی ہو گیا کہ ایک روز مراد نوری دھوبن سے باتیں کرتا ہوا پکڑا گیا۔ نوری کے بھائیوں نے اس کا پیچھا کیا اور اگر سب کمہار مراد کی مدد کو نہ نکلتے تو دھوبی مراد کے گھر گھس کر اس کی دھجیاں اڑا دیتے۔ اس روز صوبیدار نے ہادی کو بلا کر کہا کہ اگر آج کے بعد مراد نے کوئی ایسی حرکت کی تو اس سے برا کوئی نہ ہوگا۔

''اپنے اس پلے ہوئے سانڈ کی فوراً کہیں شادی لگاؤ۔'' صوبیدار نے کہا۔ ''ورنہ یہ قتل ہوگا یا جیل جائے گا۔''

واپس آتے ہوئے ہادی نے اگرچہ ادھر ادھر نہ دیکھا۔لیکن اسے محسوس ہوا کہ سب لوگ اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں بلکہ بچوں کے انبوہ دروازوں پر جمع ہیں اور عورتیں اسے دیکھنے کے لئے چھتوں پر سے لٹکی پڑ رہی ہیں۔گھر میں داخل ہوا تو وہ ٹھنڈا برف ہوا رہا تھا۔اس نے مراد سے کوئی بات نہ کی۔شرفی کے سامنے رو دیا اور وہ اس کا ساتھ دیتی رہی۔پھر دونوں آنسو پونچھ کر اٹھے اور اکھٹے نادر کمہار کے ہاں چل دیئے۔جس نے بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار تو کیا تھا مگر یہ انکار اتنا سخت نہیں تھا۔کہ ہادی اور شرفی کو اس کے پاس دوبارہ جانے کا حوصلہ نہ ہوتا۔۔۔دونوں کی آنکھیں سرخ اور سوجھی ہوئی تھیں۔اور گلیوں میں آگے پیچھے یوں چپ چاپ سر جھکائے چلے جا رہے تھے کہ سارا گاؤں ان کا مقصد بھانپ گیا۔

جب میاں بیوی نادر کمہار کے آنگن میں داخل ہوئے تو وہ چاک سے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھا سستا رہا تھا جاتے ہی شرفی نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور ہادی نے اپنی پگڑی اس کے قدموں پر ڈال دی اور پھر دونوں بیٹھ کر رونے اور آنسو پونچھنے لگے۔

نادر نے اپنے پاؤں چھڑا کر اور پگڑی ہادی کے سر پر رکھ کر اٹھا اور اندر سے ایک پیڑھی لا کر شرفی کے پاس رکھ دی۔ہادی کو اس نے چارپائی پر اپنے پاس بٹھا لیا اور بولا۔میں نے سب سن لیا ہے۔اب اس کا علاج یہی ہے کہ اس کی شادی کر دو میں جانتا ہوں تم اسی لئے میرے پاس آئے۔مگر بھیا! بات یہ ہے کہ مجھے بھی تو اس دنیا میں زندہ رہنا ہے۔بیٹی اگر تمہارے پاس چلی گئی تو میں اکیلے کیا کروں گا۔کیسے جیوں گا۔تم یوں کرو۔کہیں سے کسی بیوہ کا انتظام کر دو۔میں اسے اپنے گھر میں ڈال لوں گا تم میری بیٹی کو اپنے ہاں لے جانا۔گندی بات ہے پر سچی بات ہے۔تم دونوں جب کوئی انتظام کر لو گے تو میں بیٹی کا ہاتھ پکڑوں گا اور تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔لڑکا بدنام ہے پر بدنامیوں تو درخت کے پتوں کی گرد ہیں۔ایک چھینٹا پڑا اور غائب پیر دستگیر کی قسم لے لو۔ہاتھ ملا لو۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا اور ہادی نے آہستہ سے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔وعدہ کر کے دونوں گھر واپس آ کر کوٹھے کے اندر چلے گئے۔اور اکھ اندھیرے گوشے میں جر کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

''ڈھونڈ لیں گے۔'' شرفی بولی۔ایسی بھی کیا بات ہے۔کئی ضرورت منس بیچاریاں بیٹھی ہوں گی۔''

''آؤ ایک نظر دوڑا لیں۔'' ہادی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔اپنے گاؤں اور قریب کے دوسرے دیہات میں انہیں چار بیواؤں کے نام سوجھے۔دوسرے روز دونوں پہلے اپنے گاؤں اور پھر سوسرے دیہات میں گئے اور شام کو تھکے ہارے واپس آئے۔لڑکیوں والے تو صرف انکار ہی کرتے تھے۔بیواؤں کے وارثوں نے تو انہیں دھتکار دیا تھا۔

۔۔۔۔اور مراد صحن کے ایک کونے میں چارپائی پر بیٹھا مسلسل حقہ پیئے جا رہا تھا۔

دو سین روز تک ہادی اور شرفی ایک دوسرے کے طرف دیکھتے اور حیران ہوتے ہرے۔تیسرے روز ہادی کو ایک بیوہ کمہارن یاد آئی جو سات آٹھ کوس دور کے ایک گاؤں میں رہتی تھی اور اس کا باپ ہادی کیلئے کچھ ایسا اجنبی بھی نہیں تھا۔شرفی سے مشورہ کر کے وہ صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اندھیری شام کو تھکا ماندہ ٹوٹا ہارا۔ ہادی اپنے گاؤں داخل ہوا۔ دھوبیوں کی گلی کو طے کر کے جب وہ دوسری گلی میں مڑا، تو پرلی طرف دیوار کے ساتھ چمٹے ہوئے اسے دو سائے نظر آئے۔ وہ رک گیا اور گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے سارا گاؤں چھتوں پر چڑھ آیا ہے۔ اور اسے چیتے کی سی چمکتی ہوئی آنکھوں سے گھور رہا ہے۔

اچانک نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ وہ پکارا۔ ''مراد۔''

سائے دیوار سے اچٹ آئے۔

''گھر چلو۔'' وہ چیخا۔

ایک سایہ گلی میں تیزی سے جانے لگا۔ ہادی نے اس کا پیچھا کیا اور جب دونوں اپنے گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو ہادی نے مراد کو ہاتھ سے پکڑ کر کچھ عجیب سی گھن لگی سی آواز میں کہا۔ ''اب آرام سے اپنے گھر میں بیٹھو۔ میں کل ہی تمہارا بندوبست کئے دیتا ہوں۔''

شرفی تیر کی سی تیزی سے ہادی کے پاس آ گئی۔ ''ہو گیا کام؟'' اس نے ہادی کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ پھر چونک کر بولی۔ ''ہائے تم کیسے ٹھنڈے برف ہو رہے ہو۔''

ہادی خاموش رہا۔

''بولتے کیوں نہیں؟'' شرفی نے ہادی کو ہاتھ سے جھنجھوڑا۔ ''کیا ہوا؟'' وہ پکاری۔

''شرفی!'' وہ جیسے نیند میں بڑبڑایا۔

''ہاں کہو۔'' شرفی بولی۔

''شرفی۔'' وہ پھر اسی طرح بڑبڑایا۔ ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔'' پھر وہ پھٹے ہوئے ڈھول کی طرح گر جا۔ ''طلاق، طلاق، طلاق۔''

تڑاخ سے زمین پر گرتی ہوئی شرفی سے بے خبر وہ صحن سے باہر لپکا۔

نادر کے کواڑ ایک دھماکے سے کھلے، اور ہادی نے دیوار کے سوراخ میں رکھے ہوئے دیئے کی روشنی میں نادر کو پہچان کر اسی کھوکھلی آواز میں کہا۔ ''تم نے پیر دستگیر کی قسم کھائی تھی۔''

''ہاں کھائی تھی۔'' نادر حیران ہو کر بولا۔

''تو لڑکی کو میرے گھر چھوڑ آؤ۔'' ہادی بولا۔

قریب چارپائی پر لیٹی ہوئی لڑکی، شپ سے اندر بھاگ گئی۔

''کیوں؟'' نادر نے پوچھا۔ ''کام ہو گیا کیا؟''

''ہاں ہو گیا۔'' ہادی بولا۔

''کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

اور ہادی ٹوٹے ہوئے برتن کی سی آواز میں بولا۔ ''میں بیوی کو طلاق دے آیا ہوں۔''

FRIENDSKORNER.COM